ليتفقهوا في الدين

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک -1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	دل و نگاہ کی دنیا	افتخار عارف	۲
اداریہ	حفاظت و حفظِ قرآن کریم	مدیر	۵
مقالات	یورپ شکست کھانے والا ہے !!	صوفی جمیل الرحمٰن عباسی	۱۱
مقالات	قصیدۃ البردۃ کے منتخب اشعار	مولانا سید اسامہ علی	۱۳
مقالات	حرم کی پاسبانی	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۲۵
مقالات	قضیۂ فلسطین اور فیض احمد فیضؔ	فیض الدین احمد	۳۴
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ	صوفی جمیل الرحمٰن عباسی	۴۳
ادبیات	یہ 'مسائلِ تلفظ' یہ ترا بیان غالب	عبد الخالق بٹ	۵۰
پسلونک	مہمان نوازی کا طریقہ	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۵۳
تبصرہ	طوفان الاقصیٰ کے سات ماہ بعد	مولانا حماد احمد ترکؔ	۵۵

نعت

افتخار عارف

دل و نگاہ کی دنیا

دل و نگاہ کی دنیا نئی نئی ہوئی ہے
درود پڑھتے ہی یہ کیسی روشنی ہوئی ہے

میں بس یوں ہی تو نہیں آ گیا ہوں محفل میں
کہیں سے اذن ملا ہے تو حاضری ہوئی ہے

جہانِ کن سے ادھر کیا تھا کون جانتا ہے
مگر وہ نور کہ جس سے یہ زندگی ہوئی ہے

ہزار شکر غلامانِ شاہِ بطحا میں
شروع دن سے مری حاضری لگی ہوئی ہے

بہم تھے دامنِ رحمت سے جب تو چین سے تھے
جدا ہوئے ہیں تو اب جان پر بنی ہوئی ہے

یہ سر اٹھائے جو میں جا رہا ہوں جانبِ خلد
مرے لیے مرے آقا نے بات کی ہوئی ہے

مجھے یقیں ہے وہ آئیں گے وقتِ آخر بھی
میں کہہ سکوں گا زیارت ابھی ہوئی ہے

* * * * *

ادار یہ

حفاظت و حفظِ قرآن کریم

اللہ کریم نے قرآنِ کریم کو ابدی و دائمی ہدایت بنا کر، اپنے آخری نبیِ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر نازل فرمایا تو اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود ہی لیا اور فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹) "بے شک ہم نے آپ پر یہ نصیحت نازل کی ہے اور ہمی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ اگرچہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کتابتِ قرآن کا اہتمام بھی کیا جو آج بھی جاری و ساری ہے، لیکن حفاظتِ قرآن کریم کا اصل مدار کتابت کے بجائے حفظ یعنی زبانی یاد کرنے پر رکھا گیا۔ ایک حدیثِ قدسی میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا: «وَأَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لا يَغْسِلُهُ المَاءُ» "اے محمد! میں آپ پر وہ کتاب نازل کر رہا ہوں جسے پانی دھو نہ سکے گا"۔ پانی سے نہ دھل سکنے کی وضاحت میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: محفوظ في الصدور، "وہ کتاب سینوں میں محفوظ ہوگی"۔ اسی روایت میں آگے آتا ہے: «تَقْرَؤُهُ نَائِمًا وَيَقْظَانَ» "اے محمد! آپ اس کتاب کو پڑھیں گے حالتِ نیند میں بھی اور حالتِ بیداری میں بھی"۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: فقال العلماء: معناه يكون محفوظا لك في حالتي النوم واليقظة، وقيل: تقرؤه في يسر وسهولة. "علما فرماتے ہیں کہ اس کا معنیٰ یہ ہے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کتاب کو نیند و بیداری میں پڑھ سکیں گے، یعنی ہر حال میں آپ کو یاد رہے گی اور اس کا یہ معنیٰ بھی بیان کیا گیا کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آسانی و سہولت سے اسے پڑھ سکیں گے"۔ (صحیح مسلم مع شرح النووی)

اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سینے میں، بغیر آپ کی محنت و کوشش کے اس طرح محفوظ کر دیا جائے گا کہ آپ جب چاہیں جہاں چاہیں اسے پڑھ سکیں گے اور اس محفوظ کرنے میں آپ پر مشکل نہ ہو

گی بلکہ سہولت سے یہ کام ہوجائے گا۔ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب جبریل علیہ السلام وحی لے کر آتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن یاد کرنے کی کوشش میں بہت مشقت اٹھاتے اور جبریل علیہ السلام کی وحی کے ساتھ ساتھ دہرانے کی غرض سے زبان کو تیزی سے حرکت دیتے اس پر سورۃ القیامۃ کی یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ”اے نبی آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے تاکہ آپ جلدی حاصل کریں اس (قرآن) کو، بے شک ہمارے ذمے ہے (آپ کے سینے میں) اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوا دینا، پس پھر جب ہم اس کو (بوساطت جبریل) پڑھ چکیں تو آپ ہمارے پڑھے کی پیروی کیجیے پھر اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ہی ذمے ہے“۔ علامہ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَتَكَفَّلَ لَهُ أَنْ يَجْمَعَهُ فِي صَدْرِهِ، وَأَنْ يُيَسِّرَهُ لِأَدَائِهِ عَلَى الْوَجْهِ الَّذِي أَلْقَاهُ إِلَيْهِ، وَأَنْ يُبَيِّنَهُ لَهُ وَيُفَسِّرَهُ وَيُوَضِّحَهُ. فَالْحَالَةُ الْأُولَى جَمْعُهُ فِي صَدْرِهِ، وَالثَّانِيَةُ تِلَاوَتُهُ، وَالثَّالِثَةُ تَفْسِيرُهُ وَإِيضَاحُ مَعْنَاهُ. ”اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضمانت دی کہ وہ قرآن پاک ان کے سینے میں جمع کرے گا اور پھر جس ترتیب کے مطابق آپ پر نازل کیا گیا اسی طریقے سے قرآن کو پڑھنا بھی آپ پر آسان کر دے گا اور اس کی بھی ضمانت دی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن کی وضاحت و تفسیر بھی کرے گا۔ پس پہلی حالت رسول اللہ کے سینے میں قرآن کو محفوظ کر دینا ہے اور دوسری حالت اس کی تلاوت ہے اور تیسری حالت قرآن کی تفسیر اور معنیٰ کی وضاحت ہے“۔ آیتِ مبارکہ اور اس کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں اس طرح محفوظ کر دیے گئے کہ آپ جب چاہیں سہولت سے انھیں پڑھ سکتے اور دوسروں کو پڑھا سکتے تھے۔ دوسری اہم بات یہ کہ جس طرح قرآن کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیے گئے اسی طرح ان الفاظ کے معنیٰ بھی اللہ ہی کی طرف سے آپ کو بذریعۂ الہام سکھائے گئے۔ یہ اہم نکتہ ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے الفاظِ مبارکہ: ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ کی وضاحت میں لکھا ہے: أَيْ: بَعْدَ حِفْظِهِ وَتِلَاوَتِهِ نُبَيِّنُهُ لَكَ وَنُوَضِّحُهُ، وَنُلْهِمُكَ مَعْنَاهُ عَلَى مَا أَرَدْنَا وَشَرَعْنَا. ”یعنی قرآن پاک کے حفظ اور تلاوت آسان کرنے کے بعد ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھول کر بیان کریں گے اور اس کی وضاحت کریں گے اور اپنی مراد اور مرضی کے مطابق اس کے معنیٰ بھی آپ کو الہام کریں گے“۔ تو

حفاظتِ قرآن کا ایک مرحلہ تو یہ طے ہوا کہ الفاظِ قرآنی اپنے معنیٰ کے ساتھ نبیِ کریم ﷺ کے سینے میں محفوظ کر دیے گئے۔ اب اس کا اگلا مرحلہ درپیش تھا اور وہ تھا امّت کو قرآنِ کریم کی منتقلی۔ نبیِ کریم ﷺ نے امّت کو قرآن مجید منتقل کیا تو اگرچہ آپ ﷺ نے کتابت کو بھی اختیار کیا لیکن اس کا اصل انحصار حفظ پر ہی تھا۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ﴾ (العنکبوت:۴۹) ”بلکہ وہ واضح آیات ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنھیں علم دیا گیا“۔ تفسیرِ جلالین میں ہے: ﴿الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ﴾ أَيْ الْمُؤْمِنُونَ يَحْفَظُونَهُ، ”جنھیں علم دیا گیا، اس سے وہ اہلِ ایمان مراد ہیں جو قرآن کے حفظ کرنے والے ہیں“۔ علامہ ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: والذين أوتوا العلم: المؤمنون الذين حَمَلُوا القرآن على عهد رسول الله ﷺ و حَمَلُوا بعده وإنما أُعطي الحفظ هذه الأمة، وكان من قبلهم لا يقرءون كتابهم إِلاَّ نظراً. (زاد المسير في علم التفسير) ”جنھیں علم دیا گیا سے وہ اہلِ ایمان مراد ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی اور اس کے بعد قرآنِ پاک کی حفظ کی ذمے داری اٹھائی اور حفظ کی امتیازی خصوصیت اللہ نے اس امّت کو دی ہے اور پہلی امتّوں کے عوام اپنی کتابیں صرف دیکھ کر ہی پڑھا کرتے تھے“۔ تو نبیِ کریم ﷺ کی طرف سے علومِ وحی سینہ بہ سینہ منتقل ہوئے۔ نبیِ کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کرام کو قرآن سکھایا اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعینِ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے قرآن کا علم حاصل کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ یہ بات مشہور روایت میں بیان ہوئی ہے کہ: «يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ». (مشکاۃ المصابیح) ”یہ علم ہر اگلی نسل کے لوگ پچھلی نسل کے عادل لوگوں سے اٹھائیں گے“۔ سمجھنا یہ چاہیے کہ نبیِ کریم ﷺ کی طرف سے قرآنِ کریم کی منتقلی ”لفظ اور معنیٰ“ دونوں کے ساتھ تھی۔ تابعیِ جلیل عبد الرحمٰن السلمی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں: حَدَّثَنَا الَّذِينَ كَانُوا يُقْرِئُونَنَا أَنَّهُمْ كَانُوا يَسْتَقْرِئُونَ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ فَكَانُوا إِذَا تَعَلَّمُوا عَشْرَ آيَاتٍ لَمْ يَخْلُفُوهَا حَتَّى يَعْمَلُوا بِمَا فِيهَا مِنَ الْعَمَلِ فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا. ”جن لوگوں نے ہمیں قرآن پڑھایا (یعنی صحابۂ کرام) وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبیِ کریم ﷺ سے قرآن پڑھا کرتے تھے تو جب دس آیات پڑھ لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے یہاں تک کہ وہ جان لیں کہ ان میں عملی رہنمائی کیا ہے پس ہم نے قرآن اور عمل ساتھ ساتھ سیکھا“۔ اگرچہ عملی

احکام سیکھنا، معنیٰ و تفسیر سیکھنے کو مستلزم ہے کہ اس کے بغیر عمل سیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن ایک دوسری روایت میں اس کی تصریح میں بھی موجود ہے۔ حضرت عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: كَانَ الرَّجُلُ مِنَّا إِذَا تَعَلَّمَ عَشْرَ آيَاتٍ، لَمْ يُجَاوِزْهُنَّ حَتَّى يُعْرَفَ مَعَانِيَهُنَّ وَالْعَمَلَ بِهِنَّ. (تفسیرِ طبری) ''کہ ہم میں سے کوئی آدمی دس آیات پڑھ لیتا تو وہ آگے نہیں بڑھتا تھا یہاں تک کہ ان کے معنیٰ اور ان میں عمل کی چیزیں نہ جان لیتا''۔ فضیلتِ حفظِ قرآن و حفاظ کے متعلق وارد احادیث میں ''تعلم اور اتباع'' وغیرہ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ حفظِ قرآن معنیٰ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ سرِ دست ہم چند روایات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں:

«مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَاسْتَظْهَرَهُ فَأَحَلَّ حَلاَلَهُ وَحَرَّمَ حَرَامَهُ أَدْخَلَهُ اللهُ بِهِ الجَنَّةَ وَشَفَّعَهُ فِي عَشَرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ». (سننِ ترمذی) ''جس نے قرآن پڑھا اور اسے زبانی یاد کیا پھر اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھا تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا اور اس کے گھر والوں میں سے دس لوگوں کے حق میں شفاعت کی اجازت دے گا جو دوزخ کے مستحق بن کے تھے''۔

«مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَتَعَلَّمَهُ وَعَمِلَ بِهِ أُلْبِسَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَاجًا مِنْ نُورٍ ضَوْءُهُ مِثْلُ ضَوْءِ الشَّمْسِ، وَيُكْسَى وَالِدَيْهِ حُلَّتَانِ». (المستدرک) ''جس نے قرآن پڑھا اور اسے سیکھا اور اس پر عمل کیا تو اسے قیامت والے دن نور کا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی سے زیادہ ہوگی اور اس کے والدین کو بھی جبۂ فضیلت پہنایا جائے گا''۔

«مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَاتَّبَعَ مَا فِيهِ هَدَاهُ اللهُ مِنَ الضَّلاَلَةِ، وَوَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوءَ الْحِسَابِ، وَذَلِكَ بِأَنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ: فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى». (المستدرک) ''جس نے قرآن پڑھا اور اور جو کچھ اس قرآن میں ہے اس کی پیروی کی، اللہ اسے گمراہیوں سے بچا کر ہدایت سے نوازے گا اور قیامت کے دن اسے سخت اور برے حساب سے بچائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی وہ بدبخت ہوگا''۔

حفظِ قرآن مع التفسیر کا ایک گونہ تعلق ''تدبرِ قرآن'' کے ساتھ بھی ہے جس کا ایک خاص فائدہ جذبۂ جہاد کی

فراوانی ہے۔ سورۂ محمد میں جہاں منافقین کے جہاد سے اعراض اور ان کے اندھے بہرے بن جانے کا ذکر کیا تو اس کے فوراً بعد فرمایا: ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (محمد:۲۴) ”یہ لوگ قرآن پر تدبر کیوں نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ چکے ہیں“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تدبرِ قرآن سے دینی جذبات ترقی پاتے ہیں اور جہاد جیسے مشکل کام پر بھی انسان کمرِ ہمت کس لیتا ہے۔ اس بات کی شہادت چند تاریخی مثالوں سے بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ جنگِ یمامہ میں سینکڑوں حفاظِ کرام شہید ہوئے تھے۔ سالم مولیٰ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ بھی اس جنگ میں شامل تھے۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن سے قرآن سیکھنے کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ جنگِ یمامہ میں کسی نے آپ سے کہا کہ کیا آپ ڈرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے دشمن حملہ آور ہو جائے؟ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بِئْسَ حَامِلُ الْقُرْآنِ أَنَا إِذًا. ”میں بہت ہی برا حاملِ قرآن ہوں اگر اس بات سے ڈر جاؤں“۔ گویا کہ ان کا عالمِ قرآن ہونا بزدلی کے امکان کے منافی ہے۔ خیر جب جنگ زوروں پر پہنچی تو صحابہ آواز لگانے لگے: یا أَصْحَابَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ. ”اے سورہ بقرہ والو“۔ سیدنا ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ آواز لگا رہے تھے: يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِالْفِعَالِ. ”اے اہلِ قرآن، اپنے عمل کے ذریعے قرآن کو خوب صورت کرو“۔ آخر اہلِ قرآن کی شجاعت سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ اسی طرح جنگِ یرموک میں جب مسلمانوں پر جنگ بھاری پڑنے لگی تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سامنے آئے، آپ آوازیں لگا رہے تھے: يَا أَهلَ القرآن، ومُتَحَفَظِي الْكِتَابِ. ”اے اہلِ قرآن اور اے حفاظِ قرآن“۔ ۸۸ ہجری میں جنگِ طوانہ میں ایک بار مسلمان پسپا ہونے لگے تو عباس بن ولید بن عبد الملک نے آواز لگائی: أَيْنَ قُرَّاءُ الْقُرْآنِ الَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ؟---- يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ. ”کہاں ہیں وہ قرآن کے قاری جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں۔۔۔ اے اہلِ قرآن“۔ اس پر اہلِ قرآن اور ان کے ساتھ اہلِ اسلام نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ قلعہ فتح کر کے دم لیا۔ یہ تو ہوئی تاریخی شہادت، لیکن اب اگر عصرِ حاضر میں آپ نے ”حفظِ قرآن“ کا معجزہ دیکھنا تو وہ آپ کو اہلِ غزہ دکھائیں گے۔ حماس کی بنیاد شیخ احمد یاسین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مدرسے سے رکھی تھی اور آج بھی حماس کے حفظِ قرآن کے حلقے بڑوں اور بچوں دونوں کے لیے قائم ہیں، جہاں کلی یا جزوی طور پر حفظِ قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ حفظِ قرآن کو ان لوگوں نے ”قومی رواج“ بنا دیا

ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے ہاں حافظ پائے جاتے ہیں، ان کے مجاہد ہوں یا ان کے مجروح، اُن کے لبوں پر: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللهَ رَمَى﴾ اور ﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ کے نغمے گونج رہے ہیں۔

امّت میں قرآنِ پاک کے لفظ اور معنیٰ کی تعلیم کی مختلف صورتیں اختیار کی جاتی رہیں۔ عام طور پر بچپن میں بچوں کو الفاظِ قرآنی بطورِ ناظرہ یا بطورِ حفظ سکھا دیے جاتے ہیں اور بعد میں ترجمہ و تفسیر اور متعلقہ علوم سکھائے جاتے ہیں۔ ہماری دینی تعلیم میں زیادہ تر اسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ البتہ وہ بچے جو حفظ پر اکتفا کرتے ہیں اور باقاعدہ دینی تعلیم حاصل نہیں کرتے ان کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ قرآن کے معانی سے محروم رہتی ہے۔ ایک دوسری صورت جس کی ایجاد کا سہرا استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ابولبابہ شاہ منصور صاحب دامت برکاتہم کے سر ہے وہ ”حفاظ عربک کورس“ ہے جس میں حافظ بچوں کو ترجمۂ قرآن، عربی گرامر کے ساتھ انگریزی اور عصری علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کورس میں درسِ نظامی کے پہلے دو سال کے علاوہ میٹرک تک تعلیم کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کے لیے قدیم و جدید کے امتزاج سے ”قرآنی عربی سیکھیے“ اور ”الفاظِ قرآنی“ کے نام سے نہایت عرق ریزی سے ایک نصاب تیار کیا ہے۔ یہ ایک بہترین نظام ہے جو پاکستان میں کئی مقامات پر کامیابی سے جاری ہے۔ جن میں ہمارے ادارے ”الحکمہ وقف پاکستان“ کے بھی چند مراکز شامل ہیں۔ قرآنِ مجید کے حفظِ لفظ و معنیٰ کی تیسری صورت یہ ہے کہ بچوں کو حفظ کے ساتھ ہی معنیٰ بھی پڑھا دیے جائیں۔ اس منصوبے کو بھی حضرت مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب دامت برکاتہم کی تائید و سرپرستی حاصل ہے اور بعض جگہ اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو چکا ہے۔ ہمیں ان تین صورتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جڑ کر حفظ و حفاظتِ قرآن کی خدمت میں مصروف ہونا چاہیے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا کرے۔

* * * * *

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
مدیر ماہ نامہ مفاہیم

یورپ شکست کھانے والا ہے !!

کچھ مسلمان پِٹ رہے ہیں اور باقی تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اسرائیل مارنے والا ہے اور یورپ اسلحہ فراہم کرنے والا ہے۔ ان یورپی درندوں میں اٹلی بھی شامل ہے لیکن اس حقیقت سے بے خبر کہ عن قریب یہ خود شکست کھا کر مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب ہونے والا ہے۔ دن، مہینا اور سال ہم بتا نہیں سکتے کہ یہ کچھ ہمیں بتایا نہیں گیا، لیکن اتنا ہم کہتے ہیں کہ یہ لازماً ہو کر رہے گا۔ اگر ہم قسم اٹھا کر کہیں تو یقینی بات ہے کہ ہماری قسم جھوٹی نہیں ہوگی۔ اس کا ہونا اتنا یقینی ہے کہ جتنا ہمارا لکھنا اور آپ کا پڑھنا !! اور یقین کیوں کر نہ ہو کہ اس کی خبر صحیح حدیث میں موجود ہے۔ یہ حدیثِ پاک امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں روایت کی اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے سلسلة الأحاديث الصحيحة، میں چار نمبر کے تحت، بہت سی دوسری کتابوں کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنی لکھی ہوئی احادیث میں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: «أَيُّ الْمَدِينَتَيْنِ تُفْتَحُ أَوَّلًا الْقُسْطَنْطِينِيَّةُ أَوِ الرُّومِيَّةِ؟». "قسطنطنیہ اور رومیہ، ان دو شہروں میں سے کون سا شہر پہلے فتح ہوگا؟"، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَدِينَةُ هِرَقْلَ تُفْتَحُ أَوَّلًا». "ہِرَقل کا شہر پہلے فتح ہوگا"۔ ہم جانتے ہیں کہ ہِرَقل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم عصر بازنطینی بادشاہ (قیصر) تھا۔ ہرقل کے شہر سے مراد اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ ہے۔ چنانچہ راویِ حدیث بیان کرتے ہوئے آخر میں یہ الفاظ بڑھاتے تھے: يَعْنِي الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ. "شہرِ ہِرَقل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد قسطنطنیہ ہے"۔ اس شہر کا ایک نام بیزنطہ بھی تھا اور مسلمانوں کے ہاتھوں فتح (۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء) کے بعد اس کا نام استنبول رکھا گیا۔ رومیہ سے مراد شہر روم ہے جیسا کہ علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے: "کتاب معجم البلدان کے مطابق رومیہ، شہرِ روم ہی کا ایک نام ہے جو آج کل اٹلی کا دار الحکومت ہے۔ پہلی یعنی شہر ہرقل یا قسطنطنیہ کی فتح عثمانی خلیفہ محمد الفاتح کے ہاتھوں ہوئی اور یہ واقعہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خبر دینے کے آٹھ سو سے

زیادہ سال کے بعد پیش آیا اور دوسری فتح بھی اللہ کے حکم سے ظاہر ہوگی اور اس کا ظہور لازمی ہے"۔ نبی کریم ﷺ کی یہ پیش گوئی آپ کی دیگر پیش گوئیوں کی طرح لازماً پوری ہوگی۔ اگر چہ بظاہر حالات حوصلہ افزا نہیں لیکن قسطنطنیہ کی فتح کو یاد رکھیں اور سوچیں کہ جب مسلمان تاتاریوں کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے تو کون سوچ سکتا تھا کہ یہ امت دوبارہ سر اٹھانے کے قابل ہو کر ایک سپر پاور کے قدیمی پائے تخت کو فتح کر سکے گی لیکن چشمِ فلک نے دیکھا کہ ہمارے رسول ﷺ کی دی ہوئی خبر سچ ثابت ہوئی اور مسلمانوں نے شہرِ قیصر یعنی قسطنطنیہ فتح کر لیا۔ پس اسی طرح ایک دن آئے گا کہ اٹلی کا پائے تخت روم بھی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ اب سوچیے کہ جب اٹلی فتح ہو گا تو کیا اس کا پڑوسی فرانس مسلمانوں کی قدم بوسی سے محروم رہنا گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب ہو کر رہے گا اور اس طرح فتحِ روم پورے یورپ کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اس بڑی فتح کی بشارت احادیث میں ایک دوسرے انداز سے بھی بیان کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: «إِنَّ اللهَ زَوَى لِي الْأَرْضَ فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَإِنَّ أُمَّتِي سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا». (صحیح مسلم) "بے شک اللہ نے میرے لیے زمین کو سکیڑ دیا، پس میں نے اس کے مشرق و مغرب دیکھ لیے۔ اور بے شک میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہوگی جو مجھے لپیٹ کر دکھائے گئے"۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: «لَيَبْلُغَنَّ هَذَا الْأَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَلَا يبقى بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدخَلَهُ اللهُ هَذَا الدِّينَ بِعِزِّ عَزِيزٍ أَوْ بِذُلِّ ذَلِيلٍ عِزًّا يُعِزُّ اللهُ بِهِ الْإِسْلَامَ وَذُلًّا يُذِلُّ بِهِ الْكُفْرَ». (مسند احمد) "جہاں بھی رات ودن کا سلسلہ قائم ہے وہاں تک یہ دین پہنچے گا۔ نہ اینٹ گارے کا کوئی مکان بچے گا اور نہ اونٹ کے بالوں کا خیمہ مگر اللہ اس میں اپنے دین کو داخل کرے گا، چاہے کسی عزت والے کو عزت دے کر یا کسی ذلیل کی ذلت کے ساتھ، عزت وہ کہ جس کے ساتھ اللہ اسلام کو عزت دے گا اور ذلت وہ کہ جس کے ساتھ اللہ کفر (اور اہلِ کفر) کو ذلیل کرے گا"۔ موجودہ مشکل حالات میں نبی کریم ﷺ کی یہ احادیث ہماری حوصلہ افزائی کا سامان ہیں کہ لامحالہ فتح اسلام اور اہلِ اسلام کی ہوگی۔ ہاں اس سے پہلے آزمائشوں کا ایک دور ہے کہ جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمیں نہ صرف دین کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرنا چاہیے بلکہ جہاں جہاں ممکن ہو ہم فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کی حمایت و نصرت کریں۔

* * * * *

مولانا سید اسامہ علی
استاذ و نائب مدیر فقہ اکیڈمی

قصیدۃ البردۃ کے منتخب اشعار

حالاتِ زندگی

امام شرف الدین محمد بن سعید البوصیری رحمۃ اللہ علیہ یکم شوال ۶۰۸ھ بمطابق ۷، مارچ ۱۲۱۳ء کو مصر کے ایک قصبہ دلاص میں پیدا ہوئے۔ ان کا نسلی سلسلہ مشہور بربر قبیلے صنہاجہ تک پہنچتا ہے۔ وہ خاندان کی نسبت سے صنہاجی، مقامِ ولادت کی نسبت سے دلاصی اور مقامِ سکونت کے تعلق سے بوصیری کہلاتے ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ دیگر علومِ دینیہ کے ساتھ ساتھ علمِ ادب، بدیع، بیان اور صرف و نحو میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ شعر گوئی اور خطاطی سے بھی شغف تھا۔ حصولِ علم کے ساتھ ساتھ تصوف کے میدان میں مشہور مصری صوفی ابوالعباس احمد المرسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ:۶۸۶ھ) سے کسبِ فیض کیا، شیخ کی صحبت کے سبب ان کے کلام میں سوز و گداز نظر آتا ہے۔ قاہرہ میں فکرِ معاش انھیں ابتدا میں امرا کے درباروں میں لے گئی، جہاں وہ خطاطی، کتابت، اور شعر گوئی سے اپنی دھاک بٹھاتے رہے۔ ۵۰ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد اپنے پیر و مرشد سے تعلق قائم ہوا، زندگی کی کایا پلٹی۔ ارضِ مقدس فلسطین اور حرمین شریفین کے اسفار کیے اور ۶۹۵ھ میں مصر ہی میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

قصیدے کا تعارف

اس قصیدے کا نام الكواكب الدرية في مدح خير البرية ہے، بعض اس کو قصيدة البردة بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ پر فالج کا حملہ ہوا، جس سے میرا آدھا دھڑ سُن ہو گیا۔ جب میں اس کے علاج سے مایوس ہو گیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

شانِ اقدس میں یہ قصیدہ لکھا اور اس کے توسط سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مجھے صحت عطا فرمائے اور اس بیماری سے نجات دے۔ اس مقصد کے لیے میں نے کئی بار اس قصیدے کو نہایت الحاح و تضرع کے ساتھ پڑھا اور اسے اپنی نجات کا وسیلہ بنایا۔ اسی حالت میں مجھے نیند آگئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ جنابِ رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے اور آپ نے اپنا دستِ مبارک میرے بدن پر پھیرا اور اپنی چادر مبارک (بردہ) مجھ پر ڈال دی۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے ایسا لگا کہ میرے بدن میں حرکت پیدا ہوگئی ہے۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا، اور چلتے چلتے گھر سے باہر آگیا۔ چونکہ اس قصیدے کی برکت کے باعث امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کو فالج سے شفا حاصل ہوئی، اس لیے اس قصیدے کا نام البرءۃ (بیماری سے شفا) پڑ گیا۔ اور چونکہ انھوں نے یہ قصیدہ پڑھنے کے بعد خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی چادر (بردہ) اُتار کر اُن پر ڈال دی ہے، اس لیے اس قصیدے کو قصیدۃ البردۃ بھی کہتے ہیں اور یہی نام زیادہ مشہور بھی ہوا۔

فصلِ اول عشقِ رسول ﷺ کے ذکر میں

فصلِ اول میں آغاز کے سات اشعار تشبیب پر مشتمل ہیں، مقامات میں سب حجازی نام مذکور ہیں (ذی سلم، کاظمہ، اضم)۔

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِيْ سَلَمِ   مَزَجْتَ دَمْعًا جَرٰى مِنْ مُّقْلَةٍ بِدَمِ
أَمْ هَبَّتِ الرِّيْحُ مِنْ تِلْقَآءِ كَاظِمَةٍ   وَأَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْماءِ مِنْ إِضَمِ

”کیا تم ذی سلم کے پڑوسیوں (دوستوں) کو یاد کر کے خون کے آنسو رو رہے ہو؟ یا ان آنسوؤں کا سبب کاظمہ کی جانب سے ہوا کا چلنا یا وادیٔ اضم سے اندھیری رات میں بجلی کا چمکنا ہے؟“۔

فصلِ دوم خواہشِ نفسانی سے رُک جانے کے بیان میں

دوسری فصل میں نفسِ امارہ کی سرکشی، گناہوں پر اصرار، عملِ صالح میں کوتاہی اور غفلت پر رنج و غم کا اظہار ہے۔ نفس کو مغلوب کرنے کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ اس کی مخالفت کرو۔ طریقت اور سلوک میں ان مراحل کو

تخلیة عن الرذائل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔جس کے لیے نفس کی خواہشات کی مخالفت میں کھانے پینے، سونے، بات چیت کرنے اور لوگوں سے اختلاط میں وقتی طور پر کمی کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

فَإِنَّ أَمَّارَتِي بِالسُّوءِ مَا اتَّعَظَتْ — مِنْ جَهْلِهَا بِنَذِيرِ الشَّيْبِ وَالهَرَمِ

وَلاَ أَعَدَّتْ مِنَ الفِعْلِ الجَمِيلِ قِرَى — ضَيفٍ أَلَمَّ بِرَأْسِي غَيْرَ مُحْتَشِمِ

فَلاَ تَرُمْ بِالمَعَاصِي كَسْرَ شَهْوَتِهَا — إِنَّ الطَّعَامَ يُقَوِّي شَهْوَةَ النَّهِمِ

فَاصْرِفْ هَوَاهَا وَحَاذِرْ أَنْ تُوَلِّيَهُ — إِنَّ الهَوَى مَا تَوَلَّى يُصْمِ أَوْ يَصِمِ

وَخَالِفِ النَّفْسَ وَالشَّيْطَانَ وَاعْصِهِمَا — وَإِنْ هُمَا مَحَضَاكَ النُّصْحَ فَاتَّهِمِ

وَلاَ تُطِعْ مِنْهُمَا خَصْمًا وَلاَ حَكَمًا — فَأَنْتَ تَعْرِفُ كَيْدَ الخَصْمِ وَالحَكَمِ

”برائیوں کا حکم دینے والے میرے نفسِ امارہ نے اپنی نادانی کے سبب، پیری اور کبرِ سنی کے ڈرانے والے سے بھی نصیحت قبول نہیں کی، اور کبرِ سنی کے بے تکلفی سے سر پر پڑنے والے مہمان کی ضیافت کا سامان بہم نہ پہنچایا۔تم گناہوں سے نفس کی خواہشات کو توڑنے کا ارادہ نہ کرو، کیونکہ کھانے سے بسیار خور شخص کی شہوت کو تقویت پہنچتی ہے۔تم نفس کو اُس کی خواہشات سے روکو اور اسے اپنے اوپر مسلط کرنے سے ڈرو۔کیونکہ خواہشات جس پر مسلط ہوجائیں اسے قتل یا عیب دار کر دیتی ہیں۔تم نفس اور شیطان کی مخالفت کرو اور ان کی نافرمانی کرو، اور اگر یہ دونوں تمھیں نصیحت کریں تو انھیں جھوٹا ہی سمجھو۔اور تم نفس اور شیطان کی جنس کے کسی دشمن کی اطاعت نہ کرو، کیونکہ تم اس دشمن اور ثالث کے مکر کو جانتے ہو“۔

فصلِ سوم رسولِ اکرم ﷺ کی مدح میں

اس فصل میں آپ ﷺ کی شب زندہ داری اور فاقہ کشی کا بیان ہے۔آپ ﷺ کی صفات میں سے سید الکونین، سردارِ ثقلین، آقاے عرب وعجم، آمر بالمعروف، ناہی عن المنکر، محبوبِ خداوندی، شافعِ محشر ہونے کا بیان ہے۔لیکن اس اعتدال کا بھی بیان ہے کہ عیسائیوں کی طرح مسلمان آپ ﷺ کو خدا نہیں مانتے۔

مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْـ — ـنِ وَالفَرِيقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَمِنْ عَجَمِ

هُوَ الحَبِيبُ الذِّي تُرْجَى شَفَاعَتُهُ لِكُلِّ هَوْلٍ مِنَ الأَهْوَالِ مُقْتَحَمِ
دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارَى فِي نَبِيِّهِمِ وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيهِ وَاحْتَكِمِ
وَانْسُبْ إِلَى ذَاتِهِ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ وَانْسُبْ إِلَى قَدْرِهِ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ
أَكْرِمْ بِخَلْقِ نَبِيٍ زَانَهُ خُلُقٌ بِالحُسْنِ مُشْتَمِلٍ بِالبِشْرِ مُتَّسِمِ
كَالزَّهْرِ فِي تَرَفٍ وَالبَدْرِ فِي شَرَفٍ وَالبَحْرِ فِي كَرَمٍ وَالدَّهْرِ فِي هِمَمِ

”محمد کریم ﷺ دنیا و آخرت، انس و جن اور عرب و عجم کے سردار ہیں۔ وہ ایسے حبیب ہیں کہ ہر اُس خوف و جبر کے مقابلے میں اُن کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے جو لوگوں پر مسلط کر دیا جائے۔ جو باتیں عیسائیوں نے اپنے نبی (مسیح علیہ السلام) کی طرف منسوب کی ہیں انھیں چھوڑ دو۔ ان کے سوا آپ ﷺ کی مدح میں جو چاہو یقین کے ساتھ کہو۔ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف جس شرف کو چاہو منسوب کرو اور آپ ﷺ کے مرتبے کی جانب جس عظمت کو چاہو منسوب کرو۔ کیا ہی اچھی ہے نبیِ اکرم ﷺ کی صورت جسے حسنِ سیرت نے زینت بخشی ہے۔ یہ حسن پر مشتمل اور کشادہ روئی و خندہ پیشانی سے موسوم ہے۔ آپ ﷺ ترو تازگی میں پھول کی طرح، بلندی میں بدرِ کامل کی طرح، جود و کرم میں بحرِ زخار کی طرح اور بلند ہمتی میں زمانۂ طویل کی طرح ہیں“۔

آخری شعر تشبیہ کے اعتبار سے فصاحت و بلاغت کی معراج ہے، اور نبیِ اکرم ﷺ کا اپنی صفاتِ عالیہ کے اعتبار سے خُلقِ عظیم پر فائز ہونا بدرجۂ تمام و کمال بیان کر رہا ہے۔

فصلِ چہارم رسولِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے بارے میں

چوتھی فصل میں ارہاصاتِ نبوت (بعثت سے پہلے کے خرقِ عادت واقعات) میں سے متعلق مختلف روایات کا جامع بیان ہے۔ جن میں ایوانِ کسریٰ کے کنگروں کا گرنا، آتش کدۂ فارس کا بجھنا، بحیرۂ ساوہ کا خشک ہونا، آسمان پر نور کا چھا جانا، بتوں کا ٹوٹنا، اور شہابِ ثاقب کا برسنا قابلِ ذکر ہیں۔

أَبَانَ مَوْلِدُهُ عَنْ طِيبِ عُنْصُرِهِ يَا طِيبَ مُبْتَدَإٍ مِنْهُ وَمُخْتَتَمِ
يَوْمٌ تَفَرَّسَ فِيهِ الفُرْسُ أَنَّهُمُ قَدْ أُنْذِرُوا بِحُلُولِ البُؤْسِ وَالنِّقَمِ

وَبَاتَ إِيوَانُ كِسْرَى وَهُوَ مُنْصَدِعٌ كَشَمْلِ أَصْحَابِ كِسْرَى غَيرَ مُلْتَئِمِ

وَالنَّارُ خَامِدَةُ الأَنْفَاسِ مِنْ أَسَفٍ عَلَيْهِ وَالنَّهْرُ سَاهِي العَيْنِ مِنْ سَدَمِ

''آپ ﷺ کی ولادت سے آپ ﷺ کی اصل پاکیزگی ظاہر ہوئی۔ آپ ﷺ کا زمان و مکانِ ولادت و وفات کیا ہی پاکیزہ ہیں! وہ دن ایسا تھا کہ اہلِ فارس نے اپنی فراست سے یہ بات جان لی کہ انھیں عذاب و عقوبت کے نزول سے ڈرایا گیا ہے۔ کسریٰ (نوشیرواں) کا ایوانِ حکومت ویسے ہی پھٹ گیا جیسے کہ کسریٰ (یزدجرد) کے ساتھیوں کی جمعیت (اسلامی حملوں) سے پراگندہ ہوگئی۔ افسوس و رنج کی وجہ سے آتش کدۂ ایران کی آگ کے شعلے ماند پڑ گئے، اور دریاے فرات اپنے منبع کو بھول گیا''۔

ان اشعار میں شاعر نے دو الگ الگ ادوار کے کسریٰ کا ذکر کیا ہے۔ پہلا وہ جو نبیِ اکرم ﷺ کی پیدائش کے وقت فارس کا فرماں روا تھا، اور دوسرا وہ جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان مجاہدین کے ہاتھوں مغلوب ہوا تھا۔

فصلِ پنجم آپ ﷺ کی دعوت کے برکات اور چند مشہور معجزات کے بیان میں

فصلِ پنجم میں معجزاتِ نبوت میں سے درختوں کا سرنگوں ہونا، بادل کا سایہ فگن رہنا، آپ ﷺ کے اشارۂ انگشت سے چاند کا دو ٹکڑے ہونا، متعدّد مرتبہ آپ ﷺ کا سینۂ انور چاک کرکے پاک کرنا اور علم و نور سے بھر دیا جانا، ہجرت کے دوران کفار کی پہنچ سے معجزانہ شان کے ساتھ محفوظ رہنا مذکور ہیں۔ فصل کے اختتام پر وحی کی حقیقت پر بھی کلام کیا گیا ہے۔

جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الأَشْجَارُ سَاجِدَةً تَمْشِي إِلَيْهِ عَلَى سَاقٍ بِلاَ قَدَمِ

كَأَنَّمَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِمَا كَتَبَتْ فُرُوعُهَا مِنْ بَدِيعِ الْخَطِّ بِاللَّقَمِ

مِثْلَ الغَمَامَةِ أَنَّى سَارَ سَائِرَةً تَقِيهِ حَرَّ وَطِيسٍ لِلْهَجِيرِ حَمِي

أَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ المُنْشَقِّ إِنَّ لَهُ مِنْ قَلْبِهِ نِسْبَةً مَبْرُورَةَ القَسَمِ

''آپ ﷺ کی پکار پر درخت تابعِ فرمان ہو کر اپنے تنوں کے بل پر بغیر پیروں کے چلتے ہوئے آئے۔ گویا انھوں نے

آپ ﷺ کے کمالات کی ایک سطر کھینچ دی، جب اِن کی شاخوں نے بیچ رستے میں آپ ﷺ کی نعت میں نادر تحریر لکھی۔ اُن درختوں کا اتباع اُس بادل کی طرح تھا جو دوپہر کی گرمی کی شدت سے بچانے کے لیے آپ ﷺ کے ساتھ چلتا تھا۔ میں شق شدہ چاند کی سچی قسم کھاتا ہوں کہ اُس چاند کو نبی اکرم ﷺ سے ایک گونہ نسبت ہے"۔

چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے واقعے کو نبی اکرم ﷺ سے جو نسبت ہے، وہ شقِ صدر کے اُن متعدّد واقعات کی بنا پر ہے جن میں نبی اکرم ﷺ کا سینۂ انور چاک کر کے پاک کیا گیا، اور علم و نور سے بھر کر دوبارہ بند کیا گیا۔

وَمَا حَوَى الغَارُ مِنْ خَيْرٍ وَمِنْ كَرَمٍ وَكُلُّ طَرْفٍ مِنَ الكُفَّارِ عَنْهُ عَمِي

فَالصِّدْقُ فِي الغَارِ وَالصِّدِّيقُ لَمْ يَرِمَا وَهُمْ يَقُولُونَ مَا بِالْغَارِ مِنْ أَرِمِ

ظَنُّوا الحَمَامَ وَظَنُّوا الْعَنْكَبُوتَ عَلَى خَيْرِ الْبَرِيَّةِ لَمْ تَنْسُجْ وَلَمْ تَحُمِ

وِقَايَةُ اللهِ أَغْنَتْ عَنْ مُضَاعَفَةٍ مِنَ الدُّرُوعِ وَعَنْ عَالٍ مِنَ الأُطُمِ

"اور میں قسم کھاتا ہوں اس خیر و کرم کی جس پر غارِ ثور مشتمل تھا، جبکہ کفار کی آنکھیں اس سے اندھی تھیں۔ اُس غار میں آپ ﷺ اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ موجود تھے اور ہٹے نہ تھے، اور وہ کہتے تھے کہ غار میں کوئی بھی نہیں ہے۔ انھوں نے گمان کیا کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا نہیں بُنا اور کبوتر نے اسے اپنا گھونسلا نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت نے آپ ﷺ کو دوہرے حلقوں والی زرہوں اور بلند قلعوں سے مستغنی کر دیا"۔

ان اشعار میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کو صدق (سچائی) اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق (سچائی کی تصدیق کرنے والے) کے القاب سے ذکر کیا گیا ہے، اور ہجرت کے موقعے پر غارِ ثور کے واقعے کو نہایت دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

لاَ تُنْكِرِ الْوَحْيَ مِنْ رُؤْيَاهُ إِنَّ لَهُ قَلْبًا إِذَا نَامَتِ العَيْنَانِ لَمْ يَنَمِ

وَذَاكَ حِينَ بُلُوغٍ مِنْ نُبُوَّتِهِ فَلَيْسَ يُنْكَرُ فِيهِ حَالُ مُحْتَلِمِ

تَبَارَكَ اللهُ مَا وَحَيٌ بِمُكْتَسَبٍ وَلاَ نَبِيٌّ عَلَى غَيْبٍ بِمُتَّهَمِ

"وہ وحی جو آپ ﷺ کے پاس رویائے صادقہ سے آتی تھی اُس کا انکار مت کرو، کیونکہ آپ ﷺ کا قلبِ اطہر ایسا تھا کہ جب آنکھیں سوتی تھیں تو دل نہیں سوتا تھا۔ ان خوابوں کا ظہور آپ ﷺ کے منصبِ نبوت پر پہنچنے کے

زمانے میں ہوا، اس لیے اس میں کسی عاقل بالغ کے حال کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ بابرکت ہیں، وحی کوشش سے حاصل نہیں کی جاسکتی، اور نہ کسی نبی پر غیب کی باتوں میں غلط بیانی کی تہمت لگائی گئی ہے"۔

فصلِ ششم قرآنِ مجید کی قدر و منزلت کے بیان میں

قرآنِ مجید نبیِ اکرم ﷺ کے معجزات میں خاص تفوّق رکھتا ہے، لہٰذا اس کی فضیلت بیان کرنے کے لیے شاعر نے علیحدہ فصل قائم کی ہے۔

آيَاتُ حَقٍّ مِنَ الرَّحْمَانِ مُحْدَثَةٌ — قَدِيمَةٌ صِفَةُ المَوْصُوفِ بِالقِدَمِ

لَمْ تَقْتَرِنْ بِزَمانٍ وَهْيَ تُخْبِرُنَا — عَنِ المَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَعَنْ إِرَمِ

دَامَتْ لَدَيْنَا فَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ — مِنَ النَّبِيِّينَ إِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

مُحْكَمَاتٌ فَمَا تُبْقِيْنَ مِنْ شُبَهٍ — لِذِي شِقَاقٍ وَمَا تَبْغِيْنَ مِنْ حَكَمِ

قَرَّتْ بِهَا عَيْنُ قَارِيْهَا فَقُلْتُ لَهُ — لَقَدْ ظَفِرْتَ بِحَبْلِ اللهِ فَاعْتَصِمِ

إِنْ تَتْلُهَا خِيفَةً مِنْ حَرِّ نَارِ لَظَى — أَطْفَأْتَ حَرَّ لَظَى مِنْ وِرْدِهَا الشَّبِمِ

"رحمٰن کی یہ سچی آیات الفاظ و نزول کے اعتبار سے حادث، لیکن معانی و مفاہیم کے اعتبار سے ایسے ہی قدیم ہیں جیسے ذاتِ باری تعالیٰ قدیم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی آیات کسی زمانے سے وابستہ نہیں ہیں۔ یہ ہمیں امورِ آخرت، عاد اور ان کے مقامِ ارم کی خبریں دیتی ہیں۔ آیاتِ قرآنیہ کو دوام نصیب ہوا، اس لیے وہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے اُن معجزات پر فوقیت لے گئیں جن معجزات کو دوام نہ ملا۔ یہ آیات ایسی واضح اور پختہ ہیں کہ مخالف کے لیے کسی شک و شبہے کو باقی نہیں رکھتیں، اور نہ یہ کسی ثالث کے فیصلے کی محتاج ہیں۔ قرآن کی تلاوت سے قرآن پڑھنے والے کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں تو میں نے اُس سے کہا کہ تم نے اللہ کی رسی کو پا لیا ہے، اسے مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اگر تم نارِ جہنم کے خوف سے قرآن کی تلاوت کرو گے تو اِس کے ٹھنڈے پانی یا اِس کے ورد و وظیفے سے اُس آگ کو بجھا دو گے"۔

لفظ "ورد" سے مراد پانی کا گھاٹ بھی ہو سکتا ہے، اوراد و وظائف بھی۔ ترجمے میں دونوں معنیٰ کی رعایت کی گئی ہے۔

كَأَنَّهَا الحَوْضُ تَبْيَضُّ الوُجُوهُ بِهِ — مِنَ العُصَاةِ وَقَدْ جَاءُوهُ كَالحُمَمِ

وَكَالصِّرَاطِ وَكَالمِيزَانِ مَعْدِلَةً — فَالقِسْطُ مِنْ غَيْرِهَا فِي النَّاسِ لَمْ يَقُمِ

''یہ آیات حوضِ کوثر کی مثل ہیں جس کے پانی سے گناہ گاروں کے کوئلے جیسے چہرے اُجلے سفید ہو جاتے ہیں۔ یہ آیات عدل و انصاف میں صراط اور میزان کی طرح ہیں، اور ان کے سوا لوگوں میں عدل و انصاف قائم نہ ہوا''۔

فصلِ ہفتم رسولِ اکرم ﷺ کے سفرِ معراج کے بیان میں

یہ فصل واقعۂ اِسرا و معراج کے بیان پر مشتمل ہے، جس میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ آپ ﷺ کا انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت کروانے، ذاتِ الٰہی سے قرب کی انتہا تک پہنچنے، اور رفعت و بلندی کے اعلیٰ درجات کے حصول کا ذکر کیا گیا ہے۔

سَرَيْتَ مِنْ حَرَمٍ لَيْلاً إِلَى حَرَمٍ — كَمَا سَرَى البَدْرُ فِي دَاجٍ مِنَ الظُّلَمِ

وَبِتَّ تَرْقَى إِلَى أَنْ نِلْتَ مَنْزِلَةً — مِنْ قَابِ قَوْسَيْنِ لَمْ تُدْرَكْ وَلَمْ تُرَمِ

وَقَدَّمَتْكَ جَمِيعُ الأَنْبِيَاءِ بِهَا — وَالرُّسْلِ تَقْدِيمَ مَخْدُومٍ عَلَى خَدَمِ

وَأَنْتَ تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ بِهِمْ — فِي مَوْكِبٍ كُنْتَ فِيهِ الصَّاحِبَ العَلَمِ

بُشْرَى لَنَا مَعْشَرَ الإِسْلَامِ إِنَّ لَنَا — مِنَ العِنَايَةِ رُكْنًا غَيْرَ مُنْهَدِمِ

لَمَّا دَعَا اللهُ دَاعِينَا لِطَاعَتِهِ — بِأَكْرَمِ الرُّسْلِ كُنَّا أَكْرَمَ الأُمَمِ

''آپ ﷺ رات کے وقت حرمِ مکی سے حرمِ بیت المقدس تک یوں تشریف لے گئے جیسے ماہِ تمام شب کی ظلمتوں میں راہ طے کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے شبِ معراج ترقی کی منازل طے کیں، تاآں کہ قرب کی انتہائی منزل تک پہنچ گئے، جہاں پہنچنا نہ توکسی کے ادراک میں آسکتا ہے، اور نہ تو کوئی اُس کا قصد کر سکتا ہے۔ آپ ﷺ کو تمام انبیا و رُسل نے یوں اپنا پیشوا بنا لیا جیسے خدام اپنے آقا کو آگے کرتے ہیں۔ اور آپ ﷺ تمام انبیا و رُسل کے ہمراہ فرشتوں کی جماعت کے ساتھ ان کے قائد کی حیثیت سے ساتوں آسمانوں کو طے کر رہے تھے۔ اے مسلمانو! خوش خبری ہو کہ ہمیں عنایتِ الٰہی کا ایک ایسا ستون اور سہارا عطا کیا گیا ہے جو منہدم ہونے والا نہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ

نے ہمارے داعی ﷺ کو اکرم الرسل کہہ کر اپنی اطاعت کے لیے بلایا ہے، اس لیے ہم بھی تمام امتوں سے افضل قرار پائے"۔

یہاں مضبوط ستون اور سہارے سے مراد ذاتِ رسالت مآب ﷺ، قرآنِ مجید، یا نماز ہے، جو اس سفر میں آپ ﷺ کی امت کے لیے ہدیۃً عطا کی گئی تھی۔

فصلِ ہشتم رسولِ مکرم ﷺ کے جہاد اور غزوات کے بیان میں

نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شجاعت، غزوات کی تفصیلات، کفار کی شکست و ریخت اور اسلام کی شوکت کو کامرانی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

مَا زَالَ يَلْقَاهُمُ فِي كُلِّ مُعْتَرَكٍ　　حَتَّى حَكَوْا بِالْقَنَا لَحْمًا عَلَى وَضَمِ
وَدُّوا الفِرَارَ فَكَادُوا يَغْبِطُونَ بِهِ　　أَشْلاءَ شَالَتْ مَعَ الْعِقْبَانِ وَالرَّخَمِ
تَمْضِي اللَّيَالِي وَلاَ يَدْرُونَ عِدَّتَهَا　　مَا لَمْ تَكُنْ مِنْ لَيَالِي الأَشْهُرِ الْحُرُمِ
كَأَنَّمَا الدِّينُ ضَيْفٌ حَلَّ سَاحَتَهُمْ　　بِكُلِّ قَرْمٍ إِلَى لَحْمِ العِدَا قَرِمِ
هُمُ الجِبَالُ فَسَلْ عَنْهُمْ مُصَادِمَهُمْ　　مَاذَا رَأَى مِنْهُمُ فِي كُلِّ مُصْطَدَمِ
وَسَلْ حُنَيْنًا وَسَلْ بَدْرًا وَسَلْ أُحُدًا　　فُصُولَ حَتْفٍ لَهُمْ أَدْهَى مِنَ الوَخَمِ

"آپ ﷺ کفار سے ہمیشہ گھمسان کی لڑائیوں میں مقابلہ فرماتے رہے، یہاں تک کہ وہ اُس کٹے ہوئے گوشت کی طرح ہو گئے جسے کاٹ کر تختے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ کفار نے میدانِ جنگ سے فرار کی تمنا کی۔ گویا وہ اپنے کٹے ہوئے اعضا پر رشک کر رہے ہیں جنھیں باز اور گدھ لے اڑے تھے۔ وہ اس قدر بدحواس تھے کہ انھیں وقت گزرنے کا پتا نہ چلتا تھا، سوائے اشہرِ حُرُم کی راتوں کے کہ جن میں جنگ بندی ہوتی تھی۔ گویا دینِ اسلام ایک مہمان ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مکانوں میں اترا، اور دشمنوں کے گوشت کا نہایت خواہش مند اور مشتاق ہے۔ یہ مجاہدین پہاڑ کی طرح جم کر لڑتے ہیں۔ ان کے حریفوں سے پوچھو کہ انھوں نے گھمسان کے رن میں ان کی کیا شان دیکھی ہے؟ اور ذرا "حنین" سے پوچھو، "بدر" سے پوچھو، اور "اُحد" سے اُن طرح طرح کی ہلاکتوں کا پوچھو جو

وباؤں سے سخت بن کر نازل ہوئیں"۔

شاعر نے حنین و اُحد کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، جن میں ابتداءً سخت حالات پیش آئے، لیکن بالآخر نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم کی پامردی، دلیری، اور استقامت کی بنا پر فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔

فصل نہم اللہ تعالیٰ سے طلبِ مغفرت اور نبیِ اکرم ﷺ سے التجاے شفاعت کے بیان میں

شاعر نے اپنی سابقہ زندگی پر حسرت و افسوس کا ذکر کیا ہے، اور نبیِ اکرم ﷺ کی شفقت اور شانِ کریمی کو اپنی آخری اُمید کے طور پر ذکر کیا ہے۔

خَدَمْتُهُ بِمَدِيحٍ أَسْتَقِيلُ بِهِ ذُنُوبَ عُمْرٍ مَضَى فِي الشِّعْرِ وَالخِدَمِ
إِذْ قَلَّدَانِيَ مَا تُخْشَى عَوَاقِبُهُ كَأَنَّنِي بِهِمَا هَدْيٌ مِنَ النَّعَمِ
إِنْ آتِ ذَنْبًا فَمَا عَهْدِي بِمُنْتَقِضٍ مِنَ النَّبِيِّ وَلاَ حَبْلِي بِمُنْصَرِمِ
فَإِنَّ لِي ذِمَّةً مِنْهُ بِتَسْمِيَتِي مُحَمَّداً وَهْوَ أَوْفَى الخَلْقِ بِالذِّمَمِ
إِنْ لَمْ يَكُنْ فِي مَعَادِي آخِذًا بِيَدِي فَضْلاً وَإِلاَّ فَقُلْ يَا زَلَّةَ القَدَمِ
وَمُنْذُ أَلْزَمْتُ أَفْكَارِي مَدَائِحَهُ وَجَدْتُهُ لِخَلاَصِي خَيْرَ مُلْتَزِمِ

"میں آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں ایک مدحیہ قصیدہ پیش کر کے ایک عمر کے گناہوں کی معافی کا طالب ہوں جو شعر گوئی اور امرا کی خدمت گزاری میں بسر ہوئی۔ کیونکہ ان دونوں نے میری گردن میں ایسا قلادہ ڈال دیا ہے جس کے انجامِ کار سے ڈرا جاتا ہے، اور میں اُن اونٹوں کی طرح ہوں جو بغرضِ قربانی کعبے کی طرف لے جائے جا رہے ہوں۔ اگر میں گناہ گار ہوں تب بھی نبیِ اکرم ﷺ سے نہ تو میرا عہد ٹوٹنے والا ہے نہ ہی میرا رشتہ منقطع ہونے والا ہے۔ کیونکہ میرا نام محمد ہونے کی وجہ سے ان کی جانب سے عہد و پیمان ہے، اور وہ دنیا میں سب سے وفا کرنے والے ہیں۔ اگر آپ ﷺ آخرت میں اپنے فضل و کرم سے میری دستگیری نہ فرمائیں گے تو میرے پاؤں پھسل جائیں گے۔ میں نے جب سے آپ ﷺ کے نعتیہ اشعار کو اپنے افکار کا موضوع بنایا تو انھیں اپنی نجات کا بہترین ضامن پایا"۔

شاعر نے اپنا نام محمد ہونے سے ایک نیک فال لیا ہے، ورنہ اصلاً اعمال ہی ہیں جن کی بنیاد پر کامیابی و ناکامی

کا فیصلہ ہوتا ہے۔

فصلِ دہم مناجات اور عرضِ حاجات کے بیان میں

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گناہوں کی مغفرت اور باری تعالیٰ سے عفوِ تقصیرات کی التجا کی ہے۔

يَا أَكْرَمَ الخَلْقِ مَالِي مَنْ أَلُوذُ بِهِ — سِوَاكَ عِنْدَ حُلُولِ الحَادِثِ العَمِمِ
وَلَنْ يَضِيقَ رَسُولَ اللهِ جَاهُكَ بِي — إِذَا الكَرِيمُ تَجَلَّى بِاسْمِ مُنْتَقِمِ
فَإِنَّ مِنْ جُودِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا — وَمِنْ عُلُومِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالقَلَمِ
يَا نَفْسُ لاَ تَقْنَطِي مِنْ زَلَّةٍ عَظُمَتْ — إِنَّ الكَبَائِرَ فِي الغُفْرَانِ كَاللَّمَمِ
لَعَلَّ رَحْمَةَ رَبِّي حِينَ يَقْسِمُهَا — تَأْتِي عَلَى حَسَبِ العِصْيَانِ فِي الْقِسَمِ
يَا رَبِّ وَاجْعَلْ رَجَائِي غَيْرَ مُنْعَكِسٍ — لَدَيْكَ وَاجْعَلْ حِسَابِي غَيْرَ مُنْخَرِمِ
وَالْطُفْ بِعَبْدِكَ فِي الدَّارَيْنِ إِنَّ لَهُ — صَبْرًا مَتَى تَدْعُهُ الأَهْوَالُ يَنْهَزِمِ
وَأْذَنْ لِسُحْبِ صَلاَةٍ مِنْكَ دَائِمَةٍ — عَلَى النَّبِيِّ بِمُنْهَلٍّ وَمُنْسَجِمِ
ثُمَّ الرِّضَا عَنْ أَبِي بَكْرٍ وَعَنْ عُمَرٍ — وَعَنْ عَلِيٍّ وَعَنْ عُثْمَانَ ذِي الْكَرَمِ
وَالآلِ وَالصَّحْبِ ثُمَّ التَابِعِيَن فَهُمْ — أَهْلُ التُّقَى وَالنَّقَا وَالحِلْمِ وَالْكَرَمِ

”اے مخلوقات میں بزرگ ترین ذات! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے جس کی میں وقوعِ قیامت کے وقت پناہ لوں۔ اے رسول اللہ! جب خدائے کریم بھی انتقام لینے کی صفت سے متّصف ہوگا، اس وقت آپ کا جاہ و مرتبہ میرے بارے میں تنگ نہ ہوگا۔ کیونکہ دنیا و آخرت آپ ہی کے جود و عطا سے قائم ہیں، اور آپ کے علوم میں سے لوح و قلم کا علم بھی ہے۔ اے میرے نفس! اپنے بڑے گناہوں کی وجہ سے رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہو، کیونکہ مغفرتِ الٰہی کے سامنے کبیرہ گناہ بھی چھوٹے ہیں۔ امید ہے کہ جب میرا رب اپنی رحمت تقسیم کرے گا تو وہ میرے گناہوں کے بقدر ہوگی۔ اے میرے رب! اپنے حضور میری امید کو برعکس نہ کر، اور میرے اعتقادِ عفو و درگزر کو منقطع نہ کر۔ دونوں جہانوں میں اپنے غلام پر لطف و کرم فرما، کیونکہ اس کا صبر ایسا ہے کہ جب اسے شدائدِ زمانہ پکارتے ہیں تو

وہ شکست کھا جاتا ہے۔ اے اللہ! اپنے درود و سلام کے بادلوں کو اجازت دے کہ وہ نبیِ اکرم ﷺ پر درود و سلام کی موسلا دھار اور لگاتار بارش برسائیں۔ پھر اے اللہ! راضی ہو جا ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم سے جو سب کے سب شریف و کریم ہیں۔ اور آپ ﷺ کی آل، صحابہؓ کرام اور ان کی پیروی کرنے والوں سے، جو سب تقویٰ اور فہم و فراست والے، پاک سیرت اور حلم و کرم والے ہیں"۔

يِا رَبِّ بِالمُصْطَفَى بَلِّغْ مَقَاصِدَنَا وَاغْفِرْ لَنَا مَا مَضَى يَا وَاسِعَ الكَرَمِ

وَاغْفِرْ إِلَهِي لِكُلِ المُسْلِمِينَ بِمَا يَتْلُونَ فِي المَسْجِدِ الأَقْصَى وَفِي الحَرَمِ

"اے میرے رب! نبیِ اکرم ﷺ کے وسیلے سے ہمارے تمام مقاصد پورے فرما، اور اے وسیع کرم والے! ماضی کے تمام گناہ معاف فرما۔ اے میرے اللہ! تمام مسلمانوں کو مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ حرام میں قرآن پڑھنے کے عوض معاف فرما"۔

* * * * *

کتابیات:

شرح البردة، محمد بن عبد الله بن بهادر الزركشي، علم لإحياء التراث و الخدمات الرقمية، قاهرة، مصر، ۲۰۱۷ء

بردة المديح، پروفیسر علی محسن صدیقی، قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر محمد رشید ارشد
مدیر غزالی فورم

حرم کی پاسبانی

حرم کی پاسبانی سے متعلق علامہ اقبال کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

یہ حرم جس کا ذکر علامہ اقبال کی شاعری میں ہوتا ہے، اس کے متعلق ایک ضابطہ سمجھ لینا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں بہت سے الفاظ علامت کے طور پر استعمال کیے ہیں مثلاً شاہین، لالۂ صحرائی، شیخ، برہمن وغیرہ، ایسے ہی حرم کا لفظ وہ بہت استعمال کرتے ہیں۔ حرم بظاہر ایک جگہ ہے، جیسے حرم سے مراد حرمِ مکی یعنی خانہ کعبہ ہے جو مسلمانوں کا مرکز ہے، پھر حرم سے مراد امتِ مسلمہ بھی ہے۔ اُنھوں نے پیرِ حرم کا لفظ استعمال کیا، یہی پیرِ حرم ہے جو اکثر پیچ کھاتا ہے، ابھی میں نے آپ کے سامنے عرض کیا ہے کہ حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا۔ تو علامہ بعض اوقات امت کو حرم کہتے ہیں اور بعض اوقات حرم کا لفظ کسی نظریے، کسی ڈسکورس کے لیے بھی بولتے ہیں، جیسے ایک جگہ کہا کہ:

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے
حرم کا راز توحیدِ اُمم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے، اس کا مطلب ہے کہ اُس کے پیچھے کوئی ٹیکسٹ نہیں، کوئی نظریہ، کوئی ڈسکورس نہیں

ہے، جبکہ ہمارے پاس ہماری ایک دینی روایت ہے۔ 'پیر و مرید' میں جب علامہ نے مشکلات بیان کیں کہ امتِ مسلمہ کی اس زبوں حالی کی کیا وجہ ہے؟ تو وہاں پیرِ رومی نے یہی جواب دیا کہ:

دستِ ہر نااہل بیمارت کند

سوے مادر آ کہ تیمارت کند

ہر نااہل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر تم نے اپنے آپ کو بیمار کر دیا ہے، ماں کی طرف آؤ کہ وہ تمھاری تیمار داری کرے۔ اور یہاں ماں کا بالکل صحیح ترجمہ ہو گا کہ جو تمھارا مدر ڈسکورس اور تمھاری روایت ہے، اس کی طرف آؤ۔

علامہ اقبال نے ایک اور جگہ کہا:

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دَیر

بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رَو

کہ اس دَیر میں، اس بت کدے میں، اس دنیا میں اگر کوئی مقام و مرتبہ چاہتے ہو تو حق تعالیٰ کے ساتھ دل لگا لو اور رسول اللہ ﷺ کے رستے پہ چل پڑو۔ اور یہاں پر بھی وہ اپنے مرشد ہی کے پیرو کار ہیں، مولانا روم نے کہا تھا کہ:

من بندۂ قرآنم اگر جانِ دارم

من خاکِ درِ محمدِ مُختارم

میں قرآن کا غلام ہوں، جب تک میری جان میں جان ہے۔ اور میں محمدِ مختار ﷺ کی راہ کی خاک ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اس امت کے لیے آبرو مندی کی اگر کوئی راہ ہے تو وہ یہی راہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی راہ پر چلنا۔

اب ہم جس امتِ مسلمہ کا حصہ ہیں، اس امتِ مسلمہ کے بارے میں بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ اب ایک خیالی اور رومانوی تصور ہے، اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ بات جزوی طور پر ٹھیک ہے، یعنی امتِ مسلمہ کے جو عوام ہیں، اُن کے اندر تو ابھی بھی امت کا احساس، امت کا درد ہے، لیکن ان کے جو حکمران ہیں، جو در حقیقت قابض ہیں، اُن کے ہاں امت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یعنی یہ آپ کو معلوم ہو گا کہ پرویز مشرف صاحب جب آئے تھے تو اُنھوں نے ایک نعرہ دیا تھا: ''سب سے پہلے پاکستان''، اور بڑا عجیب سا لگا تھا کہ یہ تو بہت عجیب سی بات

کر رہے ہیں۔ حالانکہ فرق صرف یہ تھا کہ انھوں نے کہہ دیا، باقی سب کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے، ’’سب سے پہلے ایران‘‘، ’’سب سے پہلے ترکی‘‘، ’’سب سے پہلے مراکش‘‘، ’’سب سے پہلے سعودی عرب‘‘، ’’سب سے پہلے تیونس‘‘ وغیرہ۔ مشرف نے برملا کہہ دیا ورنہ امتِ مسلمہ کے جتنے حکمران ہیں، اُن سب کا مائنڈ سیٹ یہی ہے، وہ بالکل ایک خاص طرح کے نیشنلسٹک مائنڈ سیٹ کے اندر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک مفکر بینیڈکٹ اینڈرسن نے نیشن اسٹیٹس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ imagined communities ہیں، یہ مصنوعی طور پر بنائی گئی ہیں۔ لیکن آج ہمیں بدقسمتی سے لگتا ہے کہ شاید امت کا پورا تصور ایک خیالی کمیونٹی کا سا بن گیا ہے، خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب معاملہ یہ ہوا ہے کہ ہم لوگ جو مابعدِ استعمار معاشروں میں رہتے ہیں، ایک المیے کا شکار ہیں، اور وہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام اور یہاں کی ریاست ایک دوسرے کے مقابل میں کھڑے ہیں، ان کے درمیان ایک ٹکراؤ کی کیفیت ہے۔ یعنی عوام اگرچہ بے عمل ہیں لیکن اُن کے آدرش اور اُن کی تمنائیں نیک ہیں، اُن کے احساسات و جذبات ابھی بھی دینی ہیں، لیکن یہ ان کے حکمران بنیادی طور پر ایک استعماری دور کی پیداوار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ ہمیں ہندوستان کے اندر ایک ایسی خاص نسل پیدا کرنی ہے جو اپنی رنگت اور خون میں تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق میں انگریز ہو۔ یعنی ان کی آرا، ان کے اخلاق، اور ان کی مکمل ذہانت انگریزوں جیسی ہو۔ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ یہ گوراصاحب کہاں پائے جاتے ہیں تو یہ پوسٹ کالونیلز اسٹیٹ کو چلانے والے جتنے بھی بڑے ادارے ہیں، مثلاً، جوڈیشل بیوروکریسی، سول بیوروکریسی، ملٹری بیوروکریسی اور ان تینوں کی اکیڈمیز، جوڈیشل اکیڈمی، سول سروس اکیڈمی اور کاکول اکیڈمی، وہاں یہ کالے انگریز پائے جاتے ہیں۔ آج بھی کالونیل ماسٹرز جو چھوڑ کر گئے تھے، ان کی بالادستی ہے۔ ان کے تربیت یافتہ لوگ ہی ہم پر مسلط ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں جگر نے کہا تھا:

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

تو تمام پوسٹ کالونیل سوسائیٹز میں یہ اپنے وارث چھوڑ کر گئے تھے اور وہی وارث ہم پر مسلط ہیں، جو ان کی میراث کو لے کر چل رہے ہیں، اور جو شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفادار ہیں۔ ان کے بارے میں اقبالؔ نے کہا تھا کہ:

ترا وجود سراپا تجلیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

پھر جو تعلیمی نظام اُنھوں نے دیا ہے، اُس تعلیمی نظام سے وہ لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں سی ایس لوئس (مشہور عیسائی مفکر اور فلسفی) نے اپنے ۱۹۳۰ء میں انگلینڈ کے بارے میں یہ کہا تھا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں جو بچے پل رہے ہیں اور ہم جن بچوں کو وہاں تیار کر رہے ہیں، وہ "trousered apes" یعنی پتلون پہنے ہوئے بندر ہیں۔ تو اسی طریقے سے ہم پر جو لوگ مسلط ہیں، بنیادی طور پر وہ مغرب کے نقال ہیں، وہ اپنے فرنگی آقا اور مالک کی خوش نودی کو دیکھتے ہیں۔ تو کالونیل دور سے جو لوٹ مار شروع ہوئی تھی، وہ آج تک چل رہی ہے۔ علامہ اقبالؔ کی ایک نظم ہے جس میں وہ مسولینی کی زبان سے کہتے ہیں کہ:

آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج!
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج

اہلِ روم گانے بجانے اور کھانے پکانے میں پورے یورپ سے آگے تھے چنانچہ مسولینی یورپ کی استعماری قوتوں سے کہتا ہے کہ تم چاہتے ہو آلِ سیزر محض موسیقی میں مشغول رہیں اور تم بنجر علاقے بھی نہ چھوڑو، وہاں پر بھی قبضہ کرلو۔ اب اگلا مصرع بہت زبردست ہے اور یہ گویا پوری جدید تہذیب کی تسوید ہے:

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

سارے استعماری منصوبے کو تم نے ایک مُہَذَّب کارنامے کے طور پر پیش کیا۔ تم نے کہا کہ اصل میں ہم مُہَذَّب و گئے ہیں، یہ لوگ جو جانوروں کی طرح ہیں، ہم نے ان کو بھی تہذیب سے آراستہ کرنا ہے، اس کے لیے تم نے تہذیب کے پردے میں غارت گری اور آدم کُشی کی ہے۔ ایک جگہ اقبالؔ نے کہا:

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

مجھے فطرت نے ملکوتی جوہر عطا کیے ہیں، اگرچہ میں خاکی ہوں لیکن خاک سے میرا تعلق نہیں ہے۔ اب جو جدید مغرب ہے، اس کے ہاں خاکی ہونا دو طریقے سے ہے، علامہ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں ایک لفظ استعمال کیا ہے: ارتھ روٹڈنیس۔ تو ایک تصور مغرب کے ہاں خاکی ہونے کا ہے کہ وہ انسان کو محض ایک خاکی مادی وجود سمجھتے ہیں جو آب وگِل سے بنا ہے۔ وہ انسان کے اندر کسی روحانی عنصر کو نہیں مانتے، علامہ اقبالؔ نے کہا کہ:

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

افرنگ کی نگاہ میں آدمی آب و گل کا مجموعہ ہے اور اُس کے تصور میں زندگی کے کارواں کی کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ تو ہر چیز آب وگِل سے مل کے بنی ہے:

علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل
زوج زوج اندر طوافِ آب و گِل

اس دور میں چاہے علم ہو یا فن ہو، علم کا لفظ سائنس اور ٹیکنالوجی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ علم و فن ہو، دین و سیاست ہو، عقل و دل ہو، یہ سب گروہ گروہ، یہ آب وگِل، مٹی اور پانی کا طواف کر رہے ہیں۔ اور یہ بات کہ انسان ایک روحانی وجود ہے، یہ چیز اُن کے ہاں سے چلی گئی، اقبالؔ نے کہا کہ:

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز

انسان کے اندر خاکی عنصر کے ساتھ ساتھ ایک نوری عنصر بھی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: انسان میں بہیمیت بھی ہے اور مَلَکِیّت بھی ہے۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ:

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یہ آدم زاد ایک عجیب مرکب ہے، اس کے اندر فرشتوں کی سرشت بھی ہے اور اُس کے اندر ایک حیوانی عنصر بھی ہے۔ لیکن فرنگ کے نزدیک انسان محض ایک مادی وجود ہے اور یہ دنیا کی پہلی تہذیب ہے جو سراسر ایک ظاہری اور مادی تہذیب ہے، یہ مادے سے آگے کسی چیز کو نہیں مانتی۔ مغرب کے افکار میں تین چیزوں کے مقابل میں تین چیزیں آگئیں: خدا کے مقابل میں کائنات، روح کے مقابل میں جسم، اور حیاتِ اخروی کے مقابل میں حیاتِ دنیوی۔ تو اب دیکھیے کہ خدا، روح اور آخرت، یہ سب کے سب عالم الغیب سے متعلق ہیں، اور کائنات، جسم اور حیاتِ دنیوی، یہ سب کے سب عالمِ شہادت سے متعلق ہیں۔ مغرب کا سب سے بڑا مسئلہ غیب کا انکار ہے، اس نے ہر چیز کو شہود کے طور پر دیکھا:

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
ماننا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

تو ایک یہ جو تصور پیدا ہوا ہے کہ مادیت ہی اصل ہوگئی، روحانیت کا انکار کر دیا۔ علامہ اقبالؔ نے ایک اور جگہ کہا کہ تین بڑے سوالات ہوتے ہیں:

عالم از رنگ است و بے رنگی است حق
چیست عالم چیست آدم چیست حق

یہ جو دنیا ہے، یہ رنگین ہے اور حق بے رنگ ہے۔ عالم کیا ہے، آدم کیا ہے اور حق کیا ہے؟ عالم بھی مادی ہے کہ یہ مادی دنیا ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے آدم کو بھی مادی وجود کہا اور حقیقت کے بارے میں بھی کہا کہ جو انتہائی حقیقت ہے، وہ بھی مادہ ہی ہے، مادے کے سوا کچھ بھی پایا نہیں جاتا۔ تو مغربی تہذیب میں ایک مسئلہ یہ ہوا ہے کہ وہاں پر انسان کو ایک مادی وجود بنا دیا گیا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ وہاں پر انسانوں کو زمین، وطن سے جوڑ دیا گیا ہے۔ پھر نظامِ سرمایہ داری نے اسی فکرِ غرب کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا:

ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود

یہ بینک کا ادارہ چالاک یہودی کے فکر کا شاخسانہ ہے۔ ان بینکوں نے آدم کے سینے سے نورِ حق کو نکال دیا ہے:

تا تہ و بالا نگردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں، سودائے خام

جب تک یہ نظام تہ و بالا نہیں ہو گا کسی دانش، کسی تہذیب، کسی دین کا کوئی سوال نہیں، لہٰذا اس معاملے پر ہمیں چاہیے کہ سب غور کریں۔

پھر اس جال سے بچیں کہ خدانخواستہ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ریسورسز نہیں ہیں یا ہمارے پاس ٹیکنالوجی نہیں ہے یا ہم معاشی طور پر پیچھے رہ گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے اور زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں ہے، پانی جہاں مر رہا ہے، وہ ہمیں پتا ہے، وہ دین ہے، وہ ایمان ہے۔ تو اُس کی پرواہ کریں، اُس کی فکر کریں۔ اور پھر کوشش کریں، اپنی ذات سے اسوہ بنیں، جس دین کو ہم پھیلا رہے ہیں، اُس کا نمونہ بنیں۔ اس کی بنیاد پر خیر پر مبنی ایک سماج قائم کریں۔ اور پھر کوشش کریں کہ ایک ایسا نظمِ مملکت ہم قائم کریں جو حق پر قائم ہو۔ اور جو لوگ بھی حق پر نظام قائم کریں گے، سب سے پہلے انھیں جدید اداروں کی علمی تنقید پیدا کرنی ہوگی۔ اسٹیٹ پر قبضہ کرنے کے بعد سب سے پہلے اسٹیٹ کو cut to size کرنا ہو گا، اسٹیٹ کو بالکل اُس کی صحیح جگہ پر لانا ہو گا۔ اور پھر جدید جتنے بھی ادارے ہیں، اُن کی نہاد میں جو مسائل ہیں، جو لادینیت ہے، جو اُن کے ہاں مسائل ہیں، اُن پر غور کرنا ہو گا۔ ہر چیز پر اسلام کی چیپی لگانے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اُس کے درون کو دیکھیں کہ یہ اسکول کا ادارہ کہاں سے آیا ہے؟ یہ بینک کا ادارہ کہاں سے آیا؟ یہ ماڈرن مارکیٹ کہاں سے آئی؟ یہ اسٹاک ایکسچینج کہاں سے آئی؟ یہ پاگل خانے کہاں سے آئے؟ یہ اسپتال کہاں سے آئے؟ یہ سب جدید ادارے ہیں اور یہ انسانوں کو ڈسپلن کرنے کے لیے اور اُن کو جکڑنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اکبؔر الہ آبادی نے کہا کہ:

ہوئے اس قدر مُہَذَّب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

اور دوسری جگہ کہا کہ:

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

توہماری پوری زندگی اداروں میں گزرتی ہے اور وہ ادارے سارے کے سارے کالونیل بھی ہیں اور امپیریل بھی ہیں، اور وہ مطلق العنان اور لادینی ہیں۔ یہ بات کہ ہم پاکستان کو سیکیولر نہیں ہونے دیں گے، پاکستان میں سیکیولر ازم کو نہیں آنے دیں گے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام میں سے اسلامی جمہوریہ نہیں نکالنے دیں گے۔ آئین سے اسلامی شقیں نہیں نکالنے دیں گے، یہاں شراب خانے اور قحبہ خانے نہیں کھولنے دیں گے۔ یہاں پر مذہب کی بنیاد پر سیاست کرنے پر پابندی نہیں لگوانے دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں بار بار یہ عرض کرتا ہوں ماڈرن اسٹیٹ اپنی اصل میں سیکیولر ہے، تو پاکستانی اسٹیٹ بھی ایک سیکیولر اسٹیٹ ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ آپ نے اُس میں کچھ چیزیں داخل کر دی ہیں اور گویا اُس کے حوالے سے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید آپ نے اس کو اسلامیا لیا ہے۔ بینک ایک سیکیولر ادارہ ہے، اُس کو اسلامیایا نہیں جا سکتا۔ میں اسلامی یونیورسٹی میں پڑھا ہوں، مجھے پتا ہے کہ وہاں کیا حالت ہوتی ہے، جب کسی بھی جدید ادارے پر اسلام کا ٹھپہ اور چیپی آپ لگاتے ہیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا، چوں چوں کا مربہ بن جاتا ہے۔ اور اب بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں یہ سانحہ ہو گیا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ یونیورسٹیوں کو مدرسوں کے ماڈل پہ ڈھالا جاتا، اب مدرسوں کو یونیورسٹی کے ماڈل پہ ڈھالا جا رہا ہے۔ بہر حال، پھر وہی بات جو اقبالؔ نے کہی تھی کہ حل یہ ہے:

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دَیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رَو

اگر اس پرانے بت کدے میں، اس دنیا میں کوئی مقام بنانا چاہتے ہو تو ایک ہی طریقہ ہے حق تعالیٰ سے اپنے دل کو لگاؤ اور رسول اللہ ﷺ کے رستے پہ چلو۔ جارجو ایگیمبن ایک بہت مشہور اطالوی مفکر ہے، اس کا ایک ٹویٹ ہے، جو اُس نے تیس اکتوبر میں کیا، یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: scientists from the school of plant sciences at the university of Tel Aviv announce in the last few days that they had recorded with the help of special ultra sound micro phones, the screams of pain that plants make when they are cut or lack of water. ”تل ابیب یونیورسٹی کے اسکول آف پلانٹ سائنسز کے سائنس دانوں نے گذشتہ دنوں اعلان کیا تھا کہ انھوں نے خصوصی

الٹراساؤنڈ مائیکروفونز کی مدد سے اس درد کی چیخوں کو ریکارڈ کیا ہے جو پودے کٹ جانے یا پانی کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں"۔ اب اگلا جملہ سنیے اُس کے بعد کہتے ہیں: there are no micro phones in Gaza. "غزہ میں کوئی مائیکروفون نہیں ہیں"۔ یہ ہے تہذیب جو آپ نے پیدا کی ہے، یعنی آپ نے وہ طاقت پیدا کرلی کہ آپ پلانٹس کی سسکیاں سن لیں، جو اکبر نے کہا تھا کہ خوردبیں اور دوربیں تک ان کی بس اوقات ہے، مگر انسان کو یا تو جانور بنادو یا انسان کو مشین بنادو۔ تو اس مفکر نے کہا کہ تم اتنے ظالم اور سنگ دل ہو کہ پودوں کی چیخیں سننے کے لیے تم نے آلات پیدا کرلیے ہیں اور غزہ کے بچوں کی آوازیں اور اُن کی سسکیاں تمھیں سنائی نہیں دیتیں۔ تو یہ وہ تہذیب ہے جس پر ہم ناز کرتے ہیں، حالانکہ وہ لوگ جو اس تہذیب کے پروردہ ممالک میں رہتے ہیں، یقین جانیے انھیں شرمندہ ہونا چاہیے۔، اُن کو شرمندگی کے احساس کے ساتھ رہنا چاہیے کہ ہم ایک ایسے نظام کے پروردہ ہیں جو دنیا کا سب سے ظالمانہ اور سب سے زیادہ غیر انسانی نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے حال پہ رحم کرے۔

بہرحال، ہمیں کیپیٹل ازم سے لڑنا چاہیے، اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم اس کے بدترین کنزیومر بن جائیں۔ یعنی اپنے طرزِ زندگی میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ جس سے پتا لگے ہم اس سارے نظام سے کم از کم بے زار ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے بعض لوگ کہتے ہیں کہ تنقیدی شعور ہونا چاہیے، مگر مصیبت یہ ہے کہ ساری تنقید روح، دین، پیغمبر اور آخرت کے گرد گھوم رہی ہے۔ میرے نزدیک تو اس وقت اسلامی جماعتوں کی بہت بڑی خدمت یہ ہوگی کہ وہ نفسِ "اسٹیٹ" کو موضوع بنائیں، یعنی جب کبھی وہ اقتدار پر آئیں گی تو سب سے بڑی رکاوٹ اُن کے سامنے اسٹیٹ اور اسٹیٹ کی مشینری ہوگی۔ مجھے ابھی تک تو ایسے لگتا ہے کہ ان اداروں کے بارے میں ایسی کوئی آگاہی نہیں ہے۔ میری ناقص رائے میں بات یہاں سے شروع کرنی چاہیے اور ایک نئی ادارہ جاتی صف بندی کرنی چاہیے، یعنی مسجد کو مرکز بنائیں، پنچایت کو زندہ کریں۔ اور بات یہاں سے شروع ہوگی کہ سب سے پہلے اس مسئلے کی تفہیم پیدا کریں ورنہ آپ کو تو پہلے بھی حکومت ملتی رہی اور آپ بے بس رہے اور آئندہ بھی بے بس ہی ہوں گے۔

٭٭٭٭٭

فیض الدین احمد

قضیۂ فلسطین اور فیض احمد فیضؔ

عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست اور جمال عبد الناصر کے ہاتھوں شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد عرب دنیا میں تبدیلی کی جو لہر اُٹھی، اس سے ترقی پسند شعرا بھی بے حد متاثر ہوئے۔ اقبالؔ اور اس مکتبِ فکر کے ہاں مسئلہ فلسطین، امتِ مسلمہ کا مسئلہ ٹھہرا جس میں مذہبی عنصر سب سے مقدّم اور لازمی شے تھی جب کہ ترقی پسندوں کے نزدیک یہ یقیناً انسانی مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس انسانی مسئلے کو بہت سے ترقی پسند شعرا نے اپنے احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ فیضؔ کے ہاں بھی مسئلۂ فلسطین اور مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال پر متعدّد نظمیں ملتی ہیں۔ یہ نظمیں انسانی دردمندی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ نظمیں فیضؔ نے اپنے جلاوطنی کے زمانے میں کہیں۔ فیضؔ کے لیے لوٹس[1] کی ادارت کی پیش کش انگولا میں منعقدہ ایفروایشیائی ادیبوں کے اجتماع میں یاسر عرفات کے مشیرِ ثقافت اور معروف شاعر معین بسیسو لائے ''جن سے فیضؔ کی پرانی یاد اللہ تھی'' نے کی تھی، لیکن فیضؔ نے اس دعوت کو یاسر عرفات کی جانب سے باقاعدہ پیش کش اور ملاقات کے بعد قبول کیا۔ اس کے بعد وہ بیروت میں اس وقت تک قیام پذیر رہے جب تک ان کا مکان بم باری سے تباہ نہ ہو گیا۔ اس دوران فیضؔ کے کئی ممتاز شخصیات سے قریبی مراسم رہے۔ فلسطینی تحریکِ آزادی سے وابستگی کے دنوں میں معین بسیسو اور محمود درویشؔ جیسی شخصیات سے فیضؔ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ فیضؔ کے قیامِ بیروت کے زمانے کی تخلیقات میں بالواسطہ اور بلاواسطہ فلسطینی حالات کی سنگینی کا ذکر موجود ہے۔ اس دور کی شاعری وہاں کی مقامی اور عالمی حالات سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ فیضؔ اس وجہ سے عربی لب و لہجے اور عربی لفاظی میں کشش محسوس کرتے تھے۔ ان کے ہاں ''حقا''، ''بفضلِ خدا'' اور ''فرمودۂ ربِ اکبر'' وغیرہ جیسے الفاظ و تراکیب اس زمانے کی شاعری میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

---

۱ Lotus ایک ثقافتی و سیاسی مجلہ تھا جس کا پہلا پرچہ یوسف سباعی کی ادارت میں لبنان، تیونس اور مصر سے ۱۹۶۸ء میں جاری ہوا، ۱۹۷۸ء میں یوسف سباعی کی وفات کے بعد فیضؔ نے لوٹس کی ادارت سنبھالی اور تاحیات اس رسالے کے مدیر رہے۔

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے عزیز حامد مدنی کا کہنا تھا کہ یہ کاوش اس لیے تھی کہ ان کے کلام کا بآسانی عربی ترجمہ ممکن ہو۔ ان کے پانچویں مجموعہ کلام سرِوادیِ سینا کی بیش تر شاعری ان ہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ مجموعہ فیضؔ کے قیامِ کراچی کے دوران مرتب ہوا۔ جیسا کہ اس مجموعے میں شامل نظم سرِوادیِ سینا کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ عرب اسرائیل جنگ کا گہرا اثر اس میں موجود ہے۔ مجموعے میں شامل دیگر کئی نظمیں بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اپنے عہد کے بعض انتہائی اہم اور سنگین واقعات جن کا تعلق اقوامِ عالم سے تھا، فیضؔ نے ان موضوعات پر بے مثال نظمیں لکھیں۔ عرب اسرائیل جنگ اور فلسطینیوں کی جد وجہدِ آزادی کو انھوں نے ظالم و مظلوم کی آویزش قرار دیتے ہوئے ان حالات کو معروضی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔

فیضؔ نے ہمیشہ امن کی ضرورت پر زور دیا، لیکن امن جب محض خواب رہ جائے اور خواب دیکھنے والی آنکھوں میں میزائلوں کا زہر اور آتش زدہ انسانی بستیوں کا دھواں نشتر زنی کرنے لگے تو فیضؔ بھی یہ کہنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں کہ ”لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے“ عرب اسرائیل کشمکش ظاہر سی بات ہے کہ ہمارے عہد کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو ہمارے ہاں مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ فیضؔ کو بھی عرب کاز سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں نزار قبانی کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب ”پسپائی کے حاشیے“ کے عنوان سے جون ۱۹۶۷ء کے المیے پر ایک نہایت مؤثر اور باغیانہ نظم لکھی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں اس نظم کے شائع ہوتے ہی عرب دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ کئی ممالک میں تو اس نظم کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی۔ واقعہ چونکہ سنگین تھا اور عرب شعرا نے اس کو نزار قبانی کی طرح نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس طرز کی بے شمار نظمیں اس المیے پر لکھی گئیں۔ فیضؔ کی نظم سرِوادیِ سینا بھی ۱۹۶۷ء ہی میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم کو بھی عرب روایت کے مطابق حزیرانی ادب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ فیضؔ اس المیے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس مجموعے کا نام بھی سرِوادیِ سینا رکھا۔ اس کا سرِورق میں جوان کی بیٹی نے بنایا تھا، اس المیے کا عکس نمایاں ہے۔ اس نظم کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے:

پھر برق فروزاں ہے سرِوادیِ سینا پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رُخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت اے دیدۂ بینا

اسرائیلی جارحیت فیضؔ کو وادیِ سینا پر آتش و آہن کی بارش کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ان کا دل فلسطینیوں کی حالتِ

زار پر سخت مضطرب دکھائی دیتا ہے۔ نظم میں فیضؔ نے جارحیت کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ مفتیِ دین کی مصلحت کوشی پر بھی طنز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید — مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے — تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے — لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

فیضؔ کے مزاحمتی اسلوب نے سانحۂ فلسطین کے بیان میں مؤثر کردار ادا کیا۔ ان کے اس اسلوب اور رویے کو انسانی ہم دردی اور دردمندی کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی ضمیر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کے نزدیک حق و صداقت اور خیر کی ازلی قوتیں ہمیشہ فتح و نصرت سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے فیضؔ اپنی ایک نظم ''ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے'' میں کہتے ہیں کہ:

ہم جیتیں گے — حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے — کیا خوف ز یلغارِ اعدا
ہے سینہ سپر ہر غازی کا — کیا خوف ز یورشِ جیشِ قضا
صف بستہ ہیں ارواحُ الشہدا — ڈر کا ہے کا

فیضؔ کی شاعری فلسطین کے مظلوم مسلمانوں، مجاہدین کے نالہ و فریاد اور صہیونی مظالم کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ مذکورہ نظم بھی اسرائیل میں فلسطینی مسلمانوں کے قتلِ عام خصوصاً ''صابرہ اور شتیلا'' میں ستمبر ۱۹۸۲ء کے قتلِ عام کے دوران ۱۶ اور ۱۸ ستمبر کو جس بے دردی سے ۲۵۰۰ مسلمانوں کو ذبح کیا گیا اس پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ ان کے مجموعۂ کلام ''مرے دل مرے مسافر'' اور اس کے بعد جو کلام ''غبارِ ایام'' کے نام سے مرتب ہوا، وہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ ان نظموں کی تخلیق کا بیش تر حوالہ فلسطین اور اس میں رونما ہونے والے الم ناک واقعات ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عرب کاز کو کافی تقویت پہنچائی۔ ان کے پیشِ نظر فلسطین کے حوالے سے عربی شاعری کا پورا ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ جلاوطنی کا وہ احساس جو اس دور کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے، اسی دور کی نظمیں اور غزلیں ان حالات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صید تھے اب صیاد ہوئے
پہلے بھی طوافِ شمع تھی رسم محبت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصور ہوئے، فرہاد ہوئے

فلسطین کے حوالے سے سرِوادیِ سینا کے آخر میں انھوں نے واضح طور پر اس یقین کا اظہار کیا جو مظالم عربوں خصوصاً فلسطینیوں پر جاری ہیں، وہ اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ 'ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے'' لہٰذا ان مظالم کے مٹنے کا وقت بہت قریب ہے۔ شورِ محشر اور یومِ حساب کی تراکیب استعمال کرکے وہ اپنی نظموں کی معنویت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے:

پڑیں گے دار و رسن کے لالے		کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی		یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر		یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

فیضؔ ایک صاحبِ بصیرت اور روحِ عصر کے نبض شناس دانش ور تھے۔ اس بحرانی دور کی صورتِ حال کے پیش نظر، زمینی حقائق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے ہار نہ ماننے کا فیصلہ کیا۔ زمانے کے طول و عرض میں جو غبار اُڑ رہے تھے، اسے فیضؔ نے شیشۂ ساعت سے لمحہ لمحہ گرتی ریت کی طرح دیکھا، محسوس کیا اور پھر شاعری کا لازمی حصہ بنایا۔ ۱۹۷۹ء میں امریکا میں لکھی گئی اس نظم میں بھی وہ گونج اور تڑپ دکھائی دیتی ہے جس کی طرف مذکورہ صفحات میں اشارہ کیا گیا ہے:

ہم دیکھیں گے		لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے		جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں		روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے		جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حَکَم کے سر اوپر		جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی

جب ارضِ خدا کے کعبے سے — سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مردودِ حرم — مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے — سب تخت گرائے جائیں گے

قیامِ بیروت کے زمانے کی اکثر نظمیں بیروت اور اہلِ فلسطین کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں۔ بیروت کی تباہی اور فلسطینیوں کے انخلا پر ان کی نظم ''عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا'' گہرا حزنیہ تاثر چھوڑتی ہے:

لوٹ کے آکے دیکھا تو پھولوں کا رنگ — جو کبھی سرخ تھا، زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا — دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلو میں کبھی طوق کا واہمہ — کبھی پانو میں رقصِ زنجیر
اور پھر ایک دن عشق انھی کی طرح — رسن در گلو، پا بجولاں ہمیں
اس قافلے میں کشاں لے چلا

اس دور کی پوری شاعری اس فضا سے بہت قریب ہے جو عرب شعرا کی مزاحمتی شاعری کا خاصہ ہے۔ قیامِ بیروت نے فیضؔ کو فلسطینیوں کے معاملات و مسائل سے بہت قریب کر دیا۔ خود بیروت کے بارے میں ان کی نظم پڑھ کے اس شہر سے ان کی جذباتی وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

بیروت نگارِ بزم جہاں — بیروت بدیل باغِ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے — جو آئینے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لو سے — اس شہر کی راتیں روشن ہیں
اور رخشاں ہے ارضِ لبنان

قیامِ بیروت کے زمانے میں فیضؔ نے زندگی کی حقیقی جد و جہد کا ذائقہ اپنے سارے وجود میں محسوس کیا۔ اس بات کی گواہی ان کی وہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو انھوں نے فلسطین کی جد و جہدِ آزادی کے نتیجے میں بے مثال قربانیوں کے حوالے سے لکھیں۔ جون ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر کے بیروت پر قبضہ کر لیا تو پی۔ ایل۔ او کو بیروت سے اپنا مستقر ہٹانا پڑا۔ خزیران کا تجربہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۲ء تک رہا۔ اس کے بعد کی شاعری

فلسطینی مفاہمت اور المیۂ بیروت کے پس منظر میں ایک نئے رخ کو پیش کرتی ہے۔ اس دور کے کلام میں تلخی بھی ہے اور شکایتی لب ولہجہ بھی۔ ۱۹۸۰ء کی تخلیق کردہ ایک نظم ''کیا کریں'' میں شاعر نہ صرف غم زدہ نظر آتا ہے بلکہ اس غم میں بظاہر فطرت بھی اسے لہولہو دکھائی دیتی ہے۔ نظم کے آخر میں شاعر کی بے بسی اپنے نقطۂ عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کسی پہ راکھ چاند کی کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں، بتا یہ ہے، کہ محض جال ہے
مرے تمھارے عنکبوتِ وہم کا بنا ہوا جو ہے تو اس کو کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں بتا، بتا

ایک اور نظم ''فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے'' میں بھی رجائی عناصر کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ نظم کے آخر میں شاعر سرزمینِ فلسطین سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھوں نے تو صرف ایک فلسطین کو برباد کیا مگر میرے دل میں جتنے زخم لگے ہیں وہ قلم کی نوک سے لہو بن کر ٹپک رہے ہیں اور ان قطروں سے کئی فلسطین جنم لیں گے:

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

ایک اور نظم ''فلسطینی بچے کے لیے لوری'' میں فلسطین میں ہونے والی تباہ کاری کی منظرکشی کرتے ہوئے ان دردناک مناظر کو بھی پیش کیا گیا جن سے معصوم دودھ پیتے بچے نہ صرف شہید ہوئے بلکہ ان کی بے گور و کفن نعشیں دنیا سے یہ سوال کرتی رہیں کہ ان کا کیا قصور تھا؟ انھیں کس جرم کی سزا ملی؟ اس رقصِ ابلیس اور شقی القلب دشمن کی طرف سے روا رکھے جانے والے مظالم اپنے پیاروں کی لاشوں پر آہ و زاری کرتے ہوئے معصوم تنہا بچے اور ان کی آہیں، سسکیاں۔ اس حوالے سے بچے کو تسلی دیتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

مت رو بچے! تیرے آنگن میں
مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں چندرما دفنا کے گئے ہیں

مت رو بچے! امی، ابا، باجی، بھائی
چاند اور سورج تو گر روئے گا تو سب
اور بھی تجھ کو رلوائیں گے تو مسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

ایک اور نظم ”ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے“ میں فیضؔ عدو کی یلغار کے سامنے سینہ سپر ہونے والے غازیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں فتح و نصرت کی نوید بھی سناتے ہیں:

فرمودۂ ربِّ اکبر ہے جنت اپنے پاؤں تلے
اور سایۂ رحمت سر پر ہے پھر کیا ڈر ہے
ہم جیتیں گے حقا کہ ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

فیضؔ ان نظموں میں فلسطینی شعرا کے اسلوب سے خاصے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں فلسطینی شعرا سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ”ان کا ادب ان کے ہم عصروں سے کہیں زیادہ جذباتی رنگ کا حامل ہے اور ان کی زبان و بیان بھی ان کے مقابلے میں شستہ اور مرجع ہے۔ یہ فلسطینی ادیبوں اور شاعروں کی اجتماعی کوششیں ہیں، جو جدید ادب کا ایک ضخیم ذخیرہ وجود میں لانے کا سبب بنیں... اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فلسطینی شعرا نے آئیڈیل ازم اور حقائق کے درمیان خوب صورت توازن پیدا کیا ہے۔ فیضؔ آخری عہد تک اپنے مسلک پر قائم رہے۔ تحریکِ آزادیِ فلسطین کی بابت انھوں نے جہاد بالقلم کے ذریعے اپنا خوب حصہ ڈالا۔ ان کے جذبے کو سراہتے ہوئے یاسر عرفات کا کہنا تھا کہ ”فیض احمد فیضؔ جیسا اردو کا سب سے بڑا اور عظیم شاعر بین الاقوامی شہرت کا پاکستانی انقلابی اور عالم اپنے ابدی خواب کی تکمیل کے لیے ہمارے درمیان آپہنچا تھا“۔

فلسطین اور اہلِ فلسطین کے لیے کی گئی اقبالؔ اور فیضؔ کی شاعری نہ صرف اہلِ فلسطین بلکہ برصغیر کی ملی تاریخ میں بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یک جہتی کے اس عہد کی جو ابتداءً جنگِ بلقان سے ہوئی تھی وہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ اقبالؔ اور فیضؔ کی شاعری کے علاوہ اردو شاعری میں تذکرۂ فلسطین ایک لازمی عنصر کے طور پر موجود

رہا۔ خصوصاً ملیّ شاعری کا کوئی دور ایسا نہیں جس میں اردو شعرا نے قضیۂ فلسطین کو نظر انداز کیا ہو۔ عرب اسرائیل جنگ ۱۹۶۷ء اور نتیجے میں بیت المقدس کا سقوط اس کے علاوہ مسجدِ اقصیٰ میں ہونے والی آتش زدگی ۱۹۶۹ء ایسے واقعات ہیں جنھوں نے پورے عالمِ اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے سانحے کے باوجود عرب اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ نام نہاد غیر جانب داری کے اصول سے اعلانیہ بے تعلقی کا اظہار ہی دراصل موجودہ صورتِ حال میں عربوں کی اوّلین ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عرب اتحاد تو اسرائیلی جارحیت کا مؤثر جواب نہ دے سکی البتہ اسرائیل نے مزید فلسطینی علاقوں کو اپنے زیرِ تسلط ضرور کر لیا۔ مفتیِ اعظم فلسطین الحاج محمد امین الحسینی نے درست کہا کہ: اتحادِ عالمِ اسلامی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ استعمار اور اس کے جانشین ہیں، مغربی استعمار نے اپنے سامراجی مقاصد میں کامیابی ہی اس طرح حاصل کی کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر انھیں کمزور کرڈالا۔ فلسطین اور فلسطینیوں کے حقوق کے دفاع کے سلسلے میں امریکی اور یورپی بہ شمول پاکستان یہودی لابی کے تابع ہیں۔ گویا انھوں نے نام نہاد امن کے قیام کے دعوے تو خوب کیے لیکن بقول نوم چومسکی: ”سرکاری نظریہ یہی ہے کہ امریکا اور اسرائیلی لیبر پارٹی امن کی متلاشی ہیں جس کی راہ میں ہر جانب کہ انتہا پسندر کاوٹ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ جھوٹ اب تک بلا خوفِ تردید زندہ ہے اس بات کا اور گواہ ہے کہ فلسطینی انتفاضہ سے ہمارے ہاتھ جو موقع آیا تھا، ان سے فائدہ اٹھانے میں ہم کتنے ناکام رہے ہیں“۔ امریکا برطانیہ اور دیگر عالمی طاقتوں کے ساتھ خود عرب ممالک کے سربراہان اور اقوامِ متحدہ بھی بوجوہ فلسطین اور فلسطینی عوام کو انصاف نہیں دلا سکے۔ اس بے حسی کی فضا میں ہر طرف ایک عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ مشہور پاکستانی شاعر منیر نیازی نے ایک فلسطینی نظم کا اردو ترجمہ کیا وہ پوری طرح سے فلسطین کے عوام کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا — اپنے ہتھیاروں کے ساتھ
میرے دشمن میرے ہتھیار مجھ سے چھین لیں گے — میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنے ہاتھوں کے ساتھ — وہ میرے ہاتھ کاٹ دیں گے
میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا — اپنے بازوؤں کے ساتھ

وہ میرے بازو کاٹ دیں گے
میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنے جسم کے ساتھ
وہ مجھے قتل کر دیں گے
میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا
اپنی روح کے ساتھ

بلاشبہہ موجودہ عالمِ اسلام کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے جس پر آج بھی ہر مسلمان کا دل بے چین اور ہر آنکھ اشک بار ہے۔ ہمیں کھل کر اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ ایک ایسی شکست ہے جس کی نظیر اسلام کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ اسرائیل جو بین الاقوامی سازش کی پیداوار ہے ان ممالک کے عالم گیر اور وسیع ذرائع خبر رسانی، اس کی خدمت کے لیے ہر وقت کمر بستہ ہیں۔ جب تک یہ صورتِ حال باقی ہے اسرائیل کو جنگی تیاری کے ذریعے ختم کرنے کی کوششیں بظاہر کام یاب نہیں ہوں گی۔ یہ مسئلہ جنگی سے زیادہ سیاسی ہے۔ لہٰذا اسے سیاسی طور پر ہی حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح ہم متعلقہ فریقوں کے سوا بقیہ دنیا کی ہم دردیاں ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغربی دنیا کی اکثریت خصوصاً اس کے عوام کی کوئی جذباتی وابستگی اسرائیل کے ساتھ ہر گز نہیں ہے۔ اس شکست کے سائے گہرے ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ آمدِ صبح کے آثار ہی پیدا نہ ہو سکیں۔ شعرا نے امید کے دامن کو اس ضمن میں کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ شکست کے سائے میں جو فلسطین کی مسلح کش مکش اُبھری، وہ نہ صرف مقبوضہ فلسطین کے عربی شعرا کے خوابوں کی تفسیر بلکہ ان کی طویل جدوجہد کا ثمر تھی۔

* * * * *

ماخذ: مقالہ ’’تاریخِ قضیۂ فلسطین: علامہ اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ اور اقوامِ عالم‘‘، فیض الدین احمد، مشمولہ ’’عصرِ حاضر میں اسلامی تہذیب کی علمی و ادبی جہتیں، اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی، دسمبر ۲۰۲۳ء، ص: ۲۲۵ تا ۲۳۳

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ

قسط نمبر ۲۷

۱۹۳۵ء تحریکِ آزادیِ فلسطین (یعنی سیاسی جدوجہد) کا آغاز برطانوی قبضے (۱۹۱۷ء) کے بعد جلد ہی ہو گیا تھا، جس کی ابتدا کرنے والوں میں موسیٰ کاظم الحسینی سرِفہرست تھے۔ جبکہ تحریکِ جہادِ فلسطین کی بنیاد شیخ عزالدین القسّام شہید نے ۱۹۲۹ء میں رکھی اور عملی جدوجہد کا آغاز ۱۹۳۵ء میں کیا۔ جہادی راہنما عزالدین القسام نے اس وقت کے سیاسی راہنما مفتی امین الحسینی سے رابطہ کیا اور انھیں جہادی تحریک میں شمولیت یا سرپرستی کی دعوت دی، لیکن ان کے مابین اتفاق نہ ہو سکا۔ مفتی صاحب سمجھتے تھے کہ سیاسی جدوجہد ہی انھیں اپنے مقاصد سے ہم کنار کر دے گی۔ شیخ قسام کی شہادت (۱۹۳۵ء) کے بعد یہود و افرنگ کی بڑھتی سختیوں کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی و جہادی سرگرمیاں بھی بڑھتی گئیں۔ اور دونوں قسم کی تحریکیں متوازی لیکن اپنے اپنے طور طریقے سے کام کرتی رہیں۔ بقولِ افرنگ "فلسطینی عرب بغاوت" یا ثورة العربية في الفلسطين کا اطلاق ان دونوں قسم کی سرگرمیوں پر ہوتا ہے۔ اسے ہم تحریکِ انقلابِ فلسطین کہتے ہیں۔ تنظیمی اعتبار سے الگ ہونے کے باوجود یہ دونوں تحریکیں کبھی تو علانیہ اور کبھی پوشیدہ، کبھی شعوری تو کبھی غیر شعوری ایک دوسرے کو سپورٹ کرتی رہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال اس وقت سامنے آئی تھی جب ۱۹۳۷ء میں سیاسی تحریک کے بانی جناب موسیٰ کاظم الحسینی کے صاحب زادے عبدالقادر الحسینی شہید، شیخ قسام کی جہادی تحریک میں عملاً شریک ہوئے۔

تحریک کا آغاز

تحریکِ انقلابِ فلسطین کا آغاز، فروری ۱۹۳۶ء میں ہوا، جبکہ اپریل ۱۹۳۶ء سے اکتوبر ۱۹۳۶ء تک کی ششماہی

کو اس کا دورِ عروج قرار دیا جاتا ہے۔ اس عرصے میں تحریک ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ ایک طرف تو جگہ جگہ جلسے جلوس ہونے لگے اور دوسری طرف قابض قوتوں کو جا بہ جا نشانہ بنایا جانے لگا۔ برطانوی پولیس، برطانوی فوجی دستوں اور چھاؤنیوں اور کہیں کہیں یہودی بستیوں پر حملے ہونے لگے۔ بعض شہر مثلاً الخلیل اور بئرسبع تو مجاہدین نے اپنے اختیار میں لے لیے۔ اگرچہ فلسطین کے پڑوسی ممالک کے سربراہوں کا رویہ سرد مہری کا رہا لیکن ان کے عوام فلسطینیوں کے ساتھ تھے۔ کہیں تو فلسطین کے حق میں جلسے جلوس کیے جاتے اور کہیں انگریزوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے لیے ان کے قافلوں خصوصاً پٹرول کی گاڑیوں پر حملے کیے جاتے۔ بعض لوگ مجاہدینِ فلسطین کو ساز و سامان فراہم کرتے اور بعض لوگ ہتھیار سنبھال کر جہاد کی نیت سے فلسطین میں داخل ہو جاتے۔ مسلمان عوام میں مجاہدین پر اعتماد بڑھ گیا اور کئی لوگ اپنے معاملات حل کرانے کے لیے شہری حکومت کے بجائے انقلابیوں کے پاس جانا پسند کرتے۔ قسام شہید کے بعد تحریک کی قیادت عبدالرحیم الحاج محمد، شیخ فرحان السعدی اور خلیل عیسیٰ ابو ابراہیم الکبیر وغیرہ نے سنبھالی۔ ان کے علاوہ سلیمان عبدالقادر ابوعلی، شیخ عطیہ احمد، امیرِ جہاد ابو کمال، یوسف ابو درہ، عارف عبدالرزاق، احمد محمد الحسن، شیخ حسن سلامہ، عبدالرحیم الجیلانی تحریکِ جہاد کے اہم قائدین میں شمار ہوتے ہیں۔ مجاہدین ایک خاص طرح کا رومال اور عُقال اوڑھتے تھے۔ انھوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ بھی اظہارِ یکجہتی کے لیے یہ حلیہ اختیار کریں، اس طرح یہ لباس ہر طرف مشہور ہو گیا۔ مجاہدین کے لیے اس لباس میں یہ فائدہ تھا کہ ان کے لیے چھپنا آسان ہوتا تھا۔

تحریک بندی

فلسطین پر انگریزی قبضے کا یہ کمزور ترین دور تھا۔ اگر تحریک جاری رہتی تو ہر آنے والے دن کے ساتھ اس میں تیزی آتی اور آزادیِ فلسطین کی منزل نزدیک آ جاتی۔ خاص طور پر جنگِ عظیم دوم کے سالوں میں عرب انگریزوں کا بہت نقصان کر سکتے تھے۔ جنگوں یا تحریکوں میں یہ اہم ہوتا ہے کہ کب صلح کرنی ہے اور کب نہیں کرنی۔ تحریکی و جہادی میدانوں میں ابتدائی کامیابیوں کے باوجود مسلمانوں کو سیاسی میدان میں شکست ہوئی۔ اس لیے کہ انگریزوں نے اپنی کمزوری محسوس کرتے ہوئے کو اپنے "مسلمان دوستوں" سے کام لیتے ہوئے صلح کی کوششیں شروع کر دیں۔

عراقی وزیرِ خارجہ نوری سعید، شاہ اردن عبد اللہ اوّل بن ملک الفیصل، الملک الغازی بن ملک الفیصل اور سعودی بادشاہ اوّل ملک عبد العزیز کی کوششوں اور یقین دہانیوں کے نتیجے میں فلسطینی زعما تحریک روکنے پر آمادہ ہوئے اور ۱۲، اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اس کا اعلان کیا گیا۔ اس تحریکِ صلح میں زیادہ تر رابطے فلسطینی سیاسی جماعت حزب الاستقلال کے قائد اور سیکرٹری جنرل مجلس العربیہ العلیا عونی عبد الہادی کے ساتھ ہوئے۔ عونی عبد الہادی کی خط کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف سے تحریک بندی کی دو اہم شرطیں پیش کی گئی تھیں: پہلی یہ کہ یہودیوں کی ہجرت پر پابندی لگائی جائے اور دوسرے تحریک میں حصہ لینے والے حضرات کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جائے۔ لیکن ہائی کمشنر مسٹر آرتھر گرین فل واکھوب کی طرف سے ان شرطوں کی پابندی نہیں کی گئی اور جب عونی عبد الہادی کی طرف سے کمشنر کو خط لکھ کر اس طرف متوجہ کیا گیا تو اس نے جواب میں صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا اختیار حاصل نہیں، بلکہ وزیرِ نوآبادیات ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس پر مجلس العربیہ نے اپنے تحریک بندی کے فیصلے سے رجوع کرنے کا ارادہ کیا لیکن شاہانِ عرب کے مجبور کرنے سے وہ تحریک دوبارہ شروع نہ کر سکے۔

حکومتِ برطانیہ نے مسئلہ فلسطین بلکہ در حقیقت فلسطین کو ''حل'' کرنے کے لیے نومبر ۱۹۳۶ء میں رائل فلسطین کمیشن (لارڈ پیل کمیشن) قائم کیا۔ جس نے آئندہ آٹھ ماہ مسئلے کو ''حل'' کرنے میں لگا دیے۔ جہادی عناصر تحریک روکنے کے اس عمل پر ناخوش تھے اور اِکّا دُکّا کارروائیوں میں بھی مصروف رہے، لیکن تحریک کا زور بہر حال ٹوٹ چکا تھا۔

انگریزوں کی صف بندی

تحریک میں وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز نے اپنی منتشر صفیں منظم کرنا شروع کر دیں۔ اس نے برطانیہ اور مصر سے مزید فوجیں منگوائیں۔ برطانوی فوج کی تعداد بیالیس ہزار جبکہ پولیس کی تعداد بیس ہزار تک جا پہنچی۔ ساتھ ہی انھوں نے یہودی دہشت گرد تنظیموں کے ارکان کو ہنگامی طور پر مسلح کر کے انھیں فوجی تربیت دینا شروع کی اور انھیں نیوتریم کا نام دیا گیا۔ ابتدا میں انھیں یہودی بستیوں کی حفاظت پر مامور کیا گیا پھر کچھ عرصے بعد انھیں اپنی بستیوں سے باہر بھی کارروئیاں کرنے کی اجازت دی گئی اور انھیں پولیس برائے یہود بستی کا نام دے کر گویا

قانونی درجہ دیا گیا۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں قائم کردہ لارڈ پیل کمیشن کی رپورٹ آٹھ ماہ بعد ۸ جون ۱۹۳۷ء میں سامنے آئی۔ جس میں فلسطین کو تین حصوں یعنی برطانوی، یہودی اور مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز دی گئی تھی، مسلمانوں نے اس منصوبے کو بالکل رد کیا اور مفتی امین الحسینی وغیرہم نے اس پر سخت تنقید کیں۔

انتقامی کارروائیاں

انگریزوں کو منظم ہونے کے لیے جتنی فرصت درکار تھی وہ پیل کمیشن کے ہشت ماہی دور میں مل چکی تھی۔ اب جب پیل کمیشن کی رپورٹ کا انکار کیا گیا تو انھوں نے انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۷ء میں مفتی امین الحسینی صاحب کو تمام مناصب سے معزول کر دیا گیا اور ان پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ فلسطین کی حمایت اور برطانیہ و یہود کی مخالفت میں بولنا اور داخلی اور خارجی ذرائع سے ملنے والی رقوم، جہادی سرگرمیوں اور اسلحے کی خریداری وغیرہ میں صرف کرنا چھوڑ دیں۔ اسی دوران مفتی صاحب کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا لیکن حضرت ان کے ارادے کو بھانپ کر مسجد اقصیٰ میں گوشہ نشین ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آپ رازداری سے لبنان چلے گئے۔ کمشنر نے اوقاف اور محکمۂ شرعیہ کے اموال پر قبضہ کر لیا تاکہ مسلمانوں اور خصوصاً مفتی صاحب کی قوت کو توڑا جا سکے۔

گورنر کا قتل

انگریزوں کی وعدہ خلافی اور متنازع پیل کمیشن رپورٹ کی حمایت اور مسلمان قائدین پر سختی کے ردِ عمل میں عز الدین القسام کے ایک پیروکار نے ۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو الجلیل کے برطانوی گورنر لیوس اینڈریوز اور اس کے گارڈ کو ناصرہ شہر میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دوران واکھوب کی جگہ ہیرلڈ میک مائیل کو نیا ہائی کمشنر مقرر کیا جا چکا تھا۔ باوجود یہ کہ سیاسی راہنماؤں نے گورنر کے قتل سے لاتعلقی کا اظہار کیا، لیکن میک مائیل نے اس قتل کا الزام لگا کر کئی سیاست دانوں کو گرفتار جبکہ کئی ایک کو جلاوطن کر دیا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں افراد کو مشتبہ قرار دے کر قید کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت نے ثبوتِ جرم کے لیے ایک گواہی کافی قرار دے دی۔ پس جس کے خلاف بھی ایک گواہی ہوتی اسے سزائے موت دی جاتی۔ مسلمانوں کو غیر مسلح کرنے کی پالیسی پر سختی سے عمل کرنا شروع کر دیا۔ کسی

کے پاس ایک گولی بھی ملتی اسے سزائے موت دے دی جاتی، یہاں تک کہ ۱۴۸ افراد کو سزائے موت دے دی گئی۔ اور جنھیں بغیر کسی عدالتی کارروائی کے گولی مار کر شہید کر دیا گیا ان کی تعداد اس سے الگ تھی۔ اسی سالہ بزرگ مجاہد الشیخ فرحان السعدی کو نومبر ۱۹۳۷ء میں بحالتِ صیام سزائے موت دے دی گئی۔

بلودان کانفرنس

فلسطینیوں نے اپنے موقف کو منظم و مشتہر کرنے کے لیے شام کے علاقے بلودان میں ۸، ستمبر ۱۹۳۷ء کو ''قومی عرب کانفرنس'' کا انعقاد کیا جو بعد میں بلودان کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں مصر، عراق، لبنان، سوریا، اردن اور فلسطین سے ساڑھے چار سو مندوبین شامل ہوئے، جن میں محمد عزت دروَزہ صاحبِ تفسیر الحدیث، ابراہیم ناجی السویدی، محمد علی علوبہ وزیرِ اوقاف مصر، کمال الدین الطائی، محمد بہجہ الاثری، مفتی جنین شیخ ادیب الخالدی، حمد بک صعب شہید وغیرہ شامل ہوئے، جبکہ مفتی امین الحسینی حکومتی پابندیوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ کانفرنس کے اعلامیے میں تقسیمِ فلسطین اور یہودی ریاست کے قیام کی مخالفت کی گئی اور حکومتِ انتداب کے خاتمے، بالفور ڈیکلریشن کی منسوخی، عربی دستوری حکومت کے قیام، یہودی ہجرت کی بندش اور زمینوں کی خرید و فروخت اور انتقال پر پابندی کے مطالبات کیے گئے۔ لیکن یہ بے جان مطالبے تھے جن کی پشت پر کوئی طاقت نہ تھی۔ اس لیے مخالفین کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کا ثبوت اسی ماہ (ستمبر ۱۹۳۷ء) میں منعقد ہونے والا مجلسِ اقوامِ عالم کا اجلاس تھا جس میں قانونِ انتداب اور تقسیمِ فلسطین کی توثیق کی گئی۔

فروری ۱۹۳۸ء میں ''تقسیمِ فلسطین کمیشن'' قائم کیا گیا تاکہ تقسیمِ فلسطین پر فنی و انتظامی حوالے سے تجاویز مرتب کی جا سکیں۔ یہ کمیشن اپنے سربراہ سر جو ہن وڈ ہیڈ کے نام سے مشہور ہوا۔ کمیشن نے اگست ۱۹۳۸ء تک اپنی تحقیقات مکمل کر کے نومبر ۱۹۳۸ء میں اپنی رپورٹ شائع کی۔ کمیٹی نے فلسطین کو تین کے بجائے چار حصوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی۔ ایک حصہ مسلم ریاست، ایک حصہ یہودی ریاست، جبکہ بیت المقدس اور شمالی فلسطین کو دو الگ الگ لیکن حکومتِ برطانیہ کے ماتحت ریاستوں میں قائم کرنا تھا۔ البتہ اس کمیٹی نے قرار دیا کہ عرب کسی صورت تقسیم پر راضی نہ ہوں گے بلکہ پر تشدد کارروائیاں کریں گے۔ کمیشن کے ایک رکن تھامس ریڈ

شدت سے تقسیم کے اس فارمولے کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس تقسیم میں نہ تو عدل ہے اور نہ ہی اس سے امن آئے گا۔ حکومتِ برطانیہ نے اس کمیٹی کی رپورٹ پر یہ فیصلہ سنایا کہ فی الوقت تقسیم کی کوئی صورت نکلنا مشکل ہے اور آنے والے وقتوں میں حکومتِ برطانیہ اپنی ذمے داری ادا کرے گی۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں میکڈونلڈ نے برطانوی پارلیمنٹ میں بیان دیا کہ ہم یورپ میں بیٹھ کر عربوں کے ذہن کو نہیں سمجھ سکتے، پس مفاہمت کے لیے ضروری ہے کہ فلسطین اور پڑوسی ملکوں کے عرب نمائندوں اور یہودی وکالت اور تنظیموں کے نمائندوں کی ملاقاتوں کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ لندن میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ میکڈونلڈ نے بہت سارے سیاسی قیدیوں کو بھی رہا کروایا تاکہ وہ مذاکرات میں مدد کریں۔ البتہ مفتی امین الحسینی کو اس کانفرنس میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ مسلمانوں کے وفد کی قیادت جمال الحسینی نے کی۔ اس کے علاوہ عونی عبد الہادی، حسین الخالدی، کیتھولک چرچ سے تعلق رکھنے والے الفریڈ راک اور جارج انطونیوس بھی شامل تھے۔ عراق کی طرف سے نوری سعید اور مملکت سعودی کی جانب سے ملک خالد شامل ہوئے۔ مصر، عراق، یمن اور اردن کے نمائندے بھی شریک ہوئے مگر سوریا اور لبنان سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ برطانیہ کی طرف سے وزیر اعظم چیمبر لین، ویزر خارجہ ایڈورڈ ہیلی فیکس اور وزیر استعماریات میکڈونلڈ شامل تھے۔ یہودی وفد کی قیادت وائزمین نے کی، وفد میں برطانیہ، امریکہ کے علاوہ دیگر یورپی ملکوں اور جنوبی افریقہ کے یہودی نمائندے شامل تھے۔ اس کانفرنس کی بہت ساری نشستیں منعقد ہوئیں اور یہ ۷، فروری ۱۹۳۹ء سے ۱۷، مارچ ۱۹۳۹ء تک چلتی رہیں۔ یہودیوں کے مطالبات یہودی ہجرت میں وسعت، فلسطین کی تقسیم اور بالفور ڈیکلریشن کے مطابق یہودی ریاست کا قیام تھا۔ جبکہ اہلِ عرب بھی اپنے دیرینہ مطالبوں مثلاً مکمل آزادی انتدابی حکومت کا خاتمہ اور یہودی ہجرت، زمین کی خرید و فروخت اور انتقال کی ممانعت پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کانفرنس کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد ۱۷، مئی ۱۹۳۹ء کو وائٹ پیپر کے نام سے اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں مسئلہ فلسطین کی بابت کچھ خود ساختہ اصول طے کرتے ہوئے اسے دس سال تک کے لیے موخر کر دیا گیا۔

جاری ہے

* * * * *

کتابیات:

القدس و المسجد الأقصى عبر التاريخ، دكتور محمد علي البار، دارالقلم، دمشق

واقدساه، دكتور سيد حسين العفانى مكتبة دار البيان الحديثية، السعودية، الطائف

فلسطين في عهد الانتداب، دكتور أحمد طربين،shorturl.at/druNO

الثورة الكبرىٰ العربية في فلسطين، صبحي محمد ياسين،noor-book.com/wgper0

مذكرات عوني عبد الهادي، مركز دراسات الوحدةالعربية، بيروت لبنان، سبتمبر ۲۰۰۲ء

معروف عربی شاعر نزار قبانی کی فلسطین سے متعلق نظم سے اقتباس

يا أيها الثوار..

في القدس، في الخليل، في بيسان، في الأغوار

في بيت لحمٍ، حيث كنتم أيها الأحرار

تقدموا، تقدموا..

فقصة السلام مسرحية، والعدل مسرحية

إلى فلسطين طريقٌ واحدٌ، يمر من فوهة بندقية

”اے انقلابی! قدس میں، خلیل میں، بیسان میں، اغوار میں، بیتِ لحم میں...

تم جہاں جہاں بھی ہو اے آزاد لوگو! آگے بڑھو.. آگے بڑھو!

امن و سلامتی کا راگ ایک ڈرامہ ہے اور عدل ایک تماشا ہے،

فلسطین کو صرف ایک سڑک جاتی ہے جو بندوق کی نال سے گزرتی ہے“۔

عبدالخالق بٹ

یہ 'مسائلِ تلفظ' یہ ترا بیان غالب

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اسد اللہ خاں غالبؔ کا یہ شعر آدم گزیدگی سے پیدا ہونے والی آدم بیزاری کی اُس شِدّت کا اظہار ہے جب انسان خود سے بھی خوف کھاتا ہے۔ سرِدست اس شعر میں دلچسپی کا محور لفظ 'گزیدہ' ہے جو فارسی مصدر 'گزیدن' سے مشتق ہے جب کہ 'گزیدن' کے معنی 'کاٹنا اور ڈسنا' کے ہیں۔ یوں سگ گزیدہ کا مطلب کتے کا کاٹا ہوا اور مار گزیدہ کے معنی سانپ کا ڈسا ہوا ہیں۔ اردو زبان و بیان میں 'گزیدہ' سے بنی تراکیب کی فراوانی کی وجہ سے اس کے معنٰی متعیّن کرنے میں کبھی مشکل نہیں ہوئی بلکہ شب گزیدہ، خواہش گزیدہ، خلوص گزیدہ، زمانہ گزیدہ، خرد گزیدہ، روایت گزیدہ اور قمر گزیدہ کی سی خوب صورت تراکیب اردو لسانیت سے دلچسپی کا باعث بنتی رہیں۔ تاہم الجھن اُس وقت پیدا ہوئی جب 'برگُزیدہ' کی ترکیب سے واسطہ پڑا۔ اس لیے کہ یہ ترکیب جس سیاق میں برتی جاتی ہے، اُس میں 'گزیدگی' یعنی کاٹنے اور ڈسنے کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ یقین نہ آئے تو غالبؔ کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقے میں مَیں برگُزیدہ ہوں

برسبیلِ تذکرہ عرض ہے کہ غالبؔ کا شعرِ مذکور اُن کے 'غیر متداول' کلام میں سے ہے۔ یعنی یہ اور اس جیسا دیگر کلام 'نسخۂ حمیدیہ' کے سوا کسی اور نسخے میں موجود نہیں۔ گمان ہے کہ ان اشعار کے دیوان سے اخراج کا سبب بعض تیکنیکی وجوہات رہی ہوں گی، مثلاً اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں 'میں مَیں' کی تکرار میمنے کی پکار معلوم ہوتی ہے۔ 'تکرارِ قبیح' کا یہ نظّارہ بصورتِ 'پاپا' غالبؔ کے درج ذیل مشہور شعر میں بھی کیا جاسکتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

خیر ذکر تھا 'برگُزیدہ' کا جو 'سگ گزیدہ و مار گزیدہ' کی موجودگی میں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ناچار استاد سے رجوع کرنے پر عقدہ کُھلا کہ 'کاٹنے اور ڈسنے' کا مفہوم رکھنے والے 'گَزیدہ' کا تلفظ حرف اول پر 'زبر' کے ساتھ 'گزیدہ' ہے، جب کہ 'برگُزیدہ' میں شامل 'گُزیدہ' کا پہلا حرف 'پیش' کے ساتھ 'گُزِیدَہ' ہے، اور اس کے معنی 'چنیدہ، منتخب اور پسندیدہ' کے ہیں۔ بات یہ ہے کہ فارسی میں 'گَزِیدن' اور 'گُزِیدن' دو الگ مصادر ہیں، نتیجتاً ظاہری مشابہت یا مماثلت کا یہ اثران اس سے مشتق الفاظ میں بھی موجود ہیں۔ اب آگے بڑھنے سے قبل 'برگُزیدہ' کی رعایت سے نسیم دہلوی کا خوب صورت شعر ملاحظہ کریں:

چڑھتی ہے روز چادرِ گُل، جلتے ہیں چراغ
یہ ڈھیر ہے ضرور کسی برگُزیدہ کا

فارسی میں 'گَزیدن' اور 'گُزِیدن' ہی کی طرح 'گزاردن' اور 'گذاردن' کے الفاظ بھی ہیں۔ ان میں 'گزاردن' کے معنی 'ادا کرنا' جب کہ 'گذاردن' کے معنی 'ترک کرنا' کے ہیں۔ اردو میں یہ اور اِن سے مشتق الفاظ املا کی حد تک الجھن کا باعث بنتے ہیں۔ تلفظ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اردو میں 'ذال'، 'ظ' اور 'ض' تینوں کا تلفظ 'زے' کیا جاتا ہے۔ یادش بخیر ایک بار 'استاد' تحریر میں 'گذَشتہ' دیکھ کر چونک اٹھے، بولے تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ یہ لفظ 'ذال' سے نہیں 'زے' سے 'گزَشتہ' ہے۔[۲] پھر مزید انکشاف کیا کہ اردو میں 'گاف' اور 'ذال' کے اتصال سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو لغات 'گ۔ذ' کے تذکرے سے یکسر خالی ہیں۔ بات ناقابلِ یقین تھی، سو فوراً فیروز اللغات سے رجوع کیا اور یہ دیکھ دَنگ رہ گئے کہ واقعی اس میں حرف 'گاف اور ذال' سے شروع ہونے والا کوئی لفظ موجود نہیں تھا۔ ہڑبڑا کر 'فرہنگِ آصفیہ' کھولی تو وہ بھی منھ چڑا رہی تھی۔ وہاں بھی 'حرف گ' کی فہرست میں لفظ 'گدیلا' کے بعد 'گاف۔ ذال' سے کوئی لفظ موجود نہیں تھا بلکہ اگلا لفظ 'گاف۔ ڈال' سے 'گڈ' درج تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہیں تو

---

۲ اس بارے میں اختلاف ہے، درست املا ذال سے ہی ہے۔ دیکھیے رشید حسن خان کی کتاب ''اُردو کیسے لکھیں'' اور ''فرہنگِ عامرہ'' مطبوعہ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، جنوری ۱۹۸۰ء، ص: ۴۲۰

اردو زبان کی معتبر فرہنگ کے مؤلف سید احمد دہلوی بزبانِ قلم 'استاد' کے موقف کی تائید کر رہے تھے۔ اس حقیقت نما فسانے کی جڑ یہ خیال ہے کہ 'ذال' فارسی کا حرف نہیں ہے، یہ عربی زبان سے مخصوص ہے۔ لہٰذا جب یہ فارسی میں وجود ہی نہیں رکھتا تو فارسی الاصل الفاظ میں 'ذال' کی موجودگی بھی مشکوک قرار پاتی ہے۔ ایک دانشور نے کہا تھا بڑے لوگوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں، سو غالبؔ جیسے بڑے شاعر نے دیدہ دانستہ یہ غلط فہمی پیدا کی کہ 'ذال' فارسی حرف نہیں ہے۔ فرہنگ نویسوں نے غالبؔ کے کلام کی طرح اُن کے اس فرمان کو بھی الہام جانا اور 'گذشت، گذشتہ اور گذر گاہ' کے سے الفاظ کو بالترتیب 'گزَشت، گزَشتہ اور گزر گاہ' لکھ دیا۔ بات یہ ہے کہ 'زے' کی طرح 'ذال' کی آواز بھی فارسی میں موجود ہے۔ 'برہانِ قاطع' جیسی قدیم فارسی فرہنگ سے لے کر 'لغت نامہ دہ خدا' کی سی مبسوط اور معتبر فرہنگ تک میں ایسے دسیوں الفاظ درج ہیں جن میں 'ذال' موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ 'زے' و 'ذال' کے التباس سے کیسے بچا جائے، تو آسان لفظوں میں یہ سمجھ لیں کہ 'گزر، گزارا، گزارش، تہجد گزار اور مالی گزاری' کے سے الفاظ 'گزاردن' سے تعلق رکھنے کی وجہ سے 'زے' سے لکھے جائیں گے، جب کہ راہ گذر، سرگذشت اور گذشتگان' وغیرہ کے سے الفاظ میں 'گذاردن' کے تعلق سے 'ذال' برتا جائے گا۔ اس پُرپیچ بحث کے بعد اختلافِ تلفظ کی رعایت سے غالبؔ کا تصرف شدہ شعر ملاحظہ کریں:

یہ 'مسائلِ تلفظ' یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

*****

ماخذ: https://www.urdunews.com/node/703981

یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

مہمان نوازی کا طریقہ

سوال: سوال یہ ہے کہ مہمان نوازی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ آج کل مہنگائی بہت زیادہ ہوگئی تو مہمانوں کی خاطر مدارت کس طرح کی جائے؟ کیا ایک کھانا رکھا جاسکتا ہے یا زیادہ ڈشز رکھنی چاہییں؟ اگر جیب اجازت نہ دیتی ہو تو مہمان نوازی کس طرح کی جائے؟ تفصیلی رہنمائی فرمادیں۔

جواب: مہمان کے حق سے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ، وَجَائِزَتُهُ يَوْمٌ وَلَيْلَةٌ، وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَثْوِيَ عِنْدَ صَاحِبِهِ حَتَّى يُحْرِجَهُ، الضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ، وَمَا أَنْفَقَ عَلَيْهِ بَعْدَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، فَهُوَ صَدَقَةٌ» .(سنن ابن ماجہ) ”رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے اور مہمان کے لیے اچھے یعنی پُر تکلف کھانے کا اہتمام ایک دن ایک رات ہے۔ اور مہمان کے لیے یہ حلال نہیں کہ میزبان کے پاس اتنا ٹھہرے کہ وہ تنگ ہوجائے۔ اور ایک مہمانی تین دن تک ہے، اس کے بعد میزبان جو کچھ خرچ کرے گا وہ صدقہ ہوگا“۔

مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں علمائے کرام نے لکھا ہے کہ مہمان کے اکرام میں اپنی وسعت کے مطابق پہلے دن گھر کے عام کھانے میں تھوڑا تکلف کرے، مثلاً ایک کے بجائے دو کھانے ہو جائیں، اور دوسرے اور تیسرے دن گھر کا عام کھانا کھلایا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ مہمان کے لیے بہت سارے کھانے پکائے جائیں۔ اپنی وسعت کے بقدر جتنا اکرام و اعزاز کیا جاسکتا ہے، کیا جائے، اگر ایک کھانا تیار کرنے کی بھی گنجائش نہ ہو تو میزبان اپنی وسعت کے مطابق جو کچھ بھی میسر ہو پیش کر سکتا ہے۔

قوله: (وجائزته) الجائزة العطية، أي: ليتكلف في اليوم الأول بما اتسع له من بر أو ألطاف، وفي اليوم الثاني

والثالث يكفي الطعام المعتاد. (أن يثوي) من ثوى بالمكان، أي: أقام به من حد ضرب. (حتى يحرجه) بالحاء المهملة من الإحراج والتحريج والحرج هو الضيق أي: حتى يضيق عليه ويحتمل أنه بالحاء المعجمة من الإخراج، لكن المشهور رواية الأول. (حاشية السندي على سنن ابن ماجه،ج:۲،ص:۳۹۲)

جائزته: أَي الطَّعَام الْمُكَلف وَهُوَ من إجَازَة كَذَا أَي أعطَاهُ والطفه، ووجوبها كَانَت فِي ابْتِدَاء الإِسَّلَام عِنْد الْجُمْهُور ثمَّ من مَكَارِم الْأَخْلَاق. وَفِي قَوْله من كَانَ يُؤمن بِاللَّه وَالْيَوْم الاخر: إِشَارَة الى ان هَذِه الْخصْلَة من خِصَال الْمُؤمنِينَ، وَأول من سنه إِبْرَاهِيم عَلَيْهِ السَّلَام، وَذكر الْعَارِف الجامي فِي النفحات ان القطب الرباني أَبَا مَدين المغربي قيل لَهُ يَا أَبَا مَدين مَالك لَا تحترف، قَالَ: الضَّيْف إِذا نزل عنْدكُمْ كم حق ضيافته؟ قَالُوا: جائزته يَوْم وَلَيْلَة وضيافته ثَلَاثَة أَيَّام. قَالَ: الله أكبر انا نرحل من الدُّنْيَا وَيبقى لنا على رَبنَا ضيافتنا فان يَوْمًا عِنْد رَبك كالف سنة مِمَّا تَعدونَ فانا جِئْنَا فِي الدُّنْيَا ضيفا على رَبنَا فَيبقى عَلَيْهِ بقيات. وَقَوله ان يثوى: أَي يُقيم من ثوى يثوى إِذا أَقَامَ وَحَتَّى يحرجه أَي يوقعه فِي الْحَرج والضيق (إِنْجَاح) قَوْله وجائزته يَوْم وَلَيْلَة. قَالَ فِي النِّهَايَة أَي يُضَاف ثَلَاثَة أَيَّام فيتكلف فِي الْيَوْم الأول مِمَّا اتَّسع لَهُ من بر والطاف وَيقدم فِي الْيَوْم الثَّانِي وَالثَّالِث مَا حَضَره عَادَة ثمَّ يُعْطِيه مَا يجوز بِهِ مَسَافَة يَوْم وَلَيْلَة، وَتسَمى الجيزة وَهِي قدر مَا يجوز بِهِ من منهل الى منهل فَمَا كَانَ بعد ذَلِك فَهُوَ صَدَقَة مُخَيّر فِيهِ وَكره لَهُ الْمقَام بعده لِئَلَّا يضيق بِهِ اقامته مِصْبَاح الزجاجة. (شرح سنن ابن ماجه للسيوطي،ص:۲۶۱)

۱۰ نومبر ۲۰۲۲ء

فتویٰ نمبر:۵۶۶۸

واللہ اعلم بالصواب

* * * * *

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر ماہ نامہ مفاہیم کراچی

طوفان الاقصیٰ کے سات ماہ بعد

سات اکتوبر ۲۰۲۳ء کو غزہ سے جو سورج طلوع ہوا، آج اس کی روشنی سے پوری دنیا منور ہے۔ ہر نیا دن اس زمین پر اہلِ غزہ کی حمایت میں اضافہ کرتا ہے، کہیں قبلۂ اوّل کی حفاظت کی خاطر تو کہیں مظلوم فلسطینیوں سے اظہارِ یکجہتی کے لیے۔ صیہونی افواج نے شمال سے جنوب تک اہلِ فلسطین کو جھکانے کا ہر حربہ آزما لیا لیکن اب تک کوئی ہدف حاصل نہ کر سکیں۔ یہ غاصب صیہونی اپنی ریاست کی سات دہائیوں پر مبنی تاریخ ہی دیکھ لیتے تو فلسطینیوں کے جذبے اور استقامت سے غافل نہ ہوتے۔ ان کی بے عملی اور کم عقلی پر قرآنِ کریم نے ان کو گدھے سے تشبیہ دی ہے۔

غزہ میں سات اکتوبر سے اب تک پینتیس ہزار شہدا کی میتیں سپردِ خاک کی جا چکی ہیں، جو شہدا ملبے تلے ہیں ان کی تعداد معلوم نہیں۔ اٹھتر ہزار زخمیوں کی نگاہیں اپنے زخموں پر مرہم کے لیے عالمِ اسلام کی طرف اٹھی ہوئی ہیں اور عالمِ اسلام سراپا بے حسی اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ اس وقت فلسطینی مسلمان غزہ میں بھی اور مغربی کنارے میں بھی قابض افواج کے خلاف اپنی بساط کے مطابق جہاد میں مصروف ہیں۔ غزہ میں بیتِ حانون سے خان یونس تک ہر محلہ اسرائیلی بمباری سے اجڑ چکا ہے۔ صرف ایک چھوٹا سا شہر رفح باقی ہے جہاں پندرہ لاکھ فلسطینی پناہ گزیں ہیں۔ اسرائیلی وزیرِ اعظم نیتن یاہو اور دیگر وزرا بار بار رفح پر زمینی حملے کی دھمکیاں دے کر حماس کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسرائیلی شرائط پر صلح کر لے لیکن مجاہدین واضح کر چکے ہیں کہ وہ اپنی شرائط پر صلح کریں گے، ورنہ آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔ یا شہادت ملے گی یا فتح!

شمالی غزہ سے اسرائیلی فوج کے انخلا کے بعد مجاہدین نے دوبارہ مقبوضہ فلسطین پر راکٹ اور میزائل حملے شروع کر دیے ہیں۔ یمن، لبنان اور عراق سے بھی مسلسل حملوں کی خبریں الجزیرۃ پر نشر ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح مغربی کنارے میں ایک طرف مجاہدین مسلسل جہادی کارروائیوں میں مصروف ہیں، دوسری طرف فلسطینی شہری بھی قابض افواج کے خلاف مقدور بھر کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ دو ماہ میں چاقو سے حملے کے متعدّد

واقعات پیش آچکے ہیں۔ اہلِ فلسطین کی قربانیوں کی تاریخ تو بہت طویل ہے، حال ہی میں سیاحت کے لیے فلسطین آئے چونتیس سالہ ترک سیاح حسن سکالان نے مسجدِ اقصیٰ کے قریب ایک گلی میں اسرائیلی فوجی پر چاقو سے حملہ کیا اور فوجی کو زخمی کر دیا۔ فوراً ہی ایک دوسرے سپاہی نے حسن کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ حسن سکالان کا یہ عمل مشعلِ راہ ہے، ان شاءاللہ اس طرح کی کارروائیوں میں وقت کے ساتھ ساتھ مزید تیزی آتی جائے گی۔

اسرائیلی حکومت کے لیے اس وقت ایک بہت بڑا محاذ غزہ میں قید اسرائیلیوں کے اہلِ خانہ کا احتجاج ہے جو اب شدت اختیار کر چکا ہے۔ اسرائیلی میڈیا آئے روز تل ابیب، رملہ، یروشلم اور دیگر شہروں میں احتجاج کے مناظر شائع کرتا ہے۔ حالیہ جنگ کے دوران گذشتہ دنوں ایک بڑا واقعہ یہ رونما ہوا ہے کہ امریکی جامعات میں اسرائیل کو جاری کی گئی امریکی امداد کے خلاف طلبہ کا احتجاج شروع ہو چکا ہے اور خاص طور پر جامعہ کولمبیا، جامعہ کیلیفورنیا، جامعہ ایریزونا، جامعہ فورڈھم، جامعہ ٹیکساس، جامعہ فلوریڈا، جامعہ نیو میکسیکو میں بڑے پیمانے پر جبکہ بعض دیگر جامعات میں چھوٹے پیمانے پر اہلِ غزہ سے اظہارِ یکجہتی اور صیہونی مظالم کے خاتمے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ مذکورہ جامعات میں طلبہ خیمے ڈال کر جامعہ کے احاطوں میں مقیم ہیں اور متعدّد اساتذہ بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ پولیس مار پیٹ، شیلنگ، گرفتاریوں اور رکاوٹوں کے باوجود انھیں روکنے میں ناکام ہے۔ جرمنی، فرانس اور برطانیہ سے بھی کہیں کہیں اس طرح کے واقعات نشر ہوئے ہیں۔

ان سطور میں ہم نے معرکۂ طوفان الاقصیٰ کی حالیہ صورتِ حال پر تبصرے کی کوشش کی ہے، ہم قارئین سے گزارش کرتے ہیں کہ قضیۂ فلسطین کو ہر جگہ اور ہر وقت پیشِ نظر رکھیں۔ کہیں گفتگو سے، کہیں تحریر سے، کہیں سوشل میڈیا پر تبصرے سے اور کہیں فلسطینی جھنڈے اور رومال سے قضیۂ فلسطین کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں۔ اپنے حلقوں میں اس قضیے سے متعلق آگاہی پیدا کریں اور اہلِ فلسطین کے لیے دعاؤں کا اہتمام کرتے رہیں۔ خود بھی وہاں کے لیے زکوٰۃ و صدقات بھیجنے کا اہتمام کریں اور لوگوں کو بھی اس جانب راغب کریں۔ قضیۂ فلسطین کی تفہیم کے لیے ماہ نامہ ”مفاہیم القدس نمبر“ اگر آپ تک نہیں پہنچا تو ابھی حاصل کیجیے اور نظریاتی سطح پر بھی اس مسئلے کی اہمیت سے خود کو آگاہ رکھیے۔ اسرائیلی مصنوعات کے بائیکاٹ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیجیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

* * * * *